سندس جبیں

قافلے راہ بھول جاتے ہیں

"اریجہ! کدھر ہو بھئی؟"

وہ جو رٹا مارنے میں مگن تھی۔ یک دم چونکی۔

"جی لالہ!" اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور تیزی سے باہر بھاگی۔ طویل راہداری عبور کرتے ہی اسے منصور مل گیا۔

"کدھر ہیں سب؟" وہ خاصا جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"آپ کو کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔"

"اچھا! پھر کھانا لگاؤ۔ فیصل آیا ہے۔ مجھے آواز دے دینا۔" وہ حکم جاری کرتا واپس مڑ گیا۔

اریجہ طویل سانس لیتی کچن کی طرف مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے کھانا لگایا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب آ کر ہلکے سے پکاری۔

"لالہ! میں نے کھانا لگا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" منصور کی بھاری آواز ابھری۔

وہ شکر ادا کرتی واپس آ گئی مگر پڑھنے کا سارا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ بی اے میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا اگرچہ کالج ان کے علاقے سے پون گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا اور اس کے مزید پڑھنے پر "ملک ہاؤس" میں کوئی اتنا خاص آمادہ بھی نہیں تھا مگر بھلا ہو منصور لالہ کا جو سب کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔

مکمل ناول

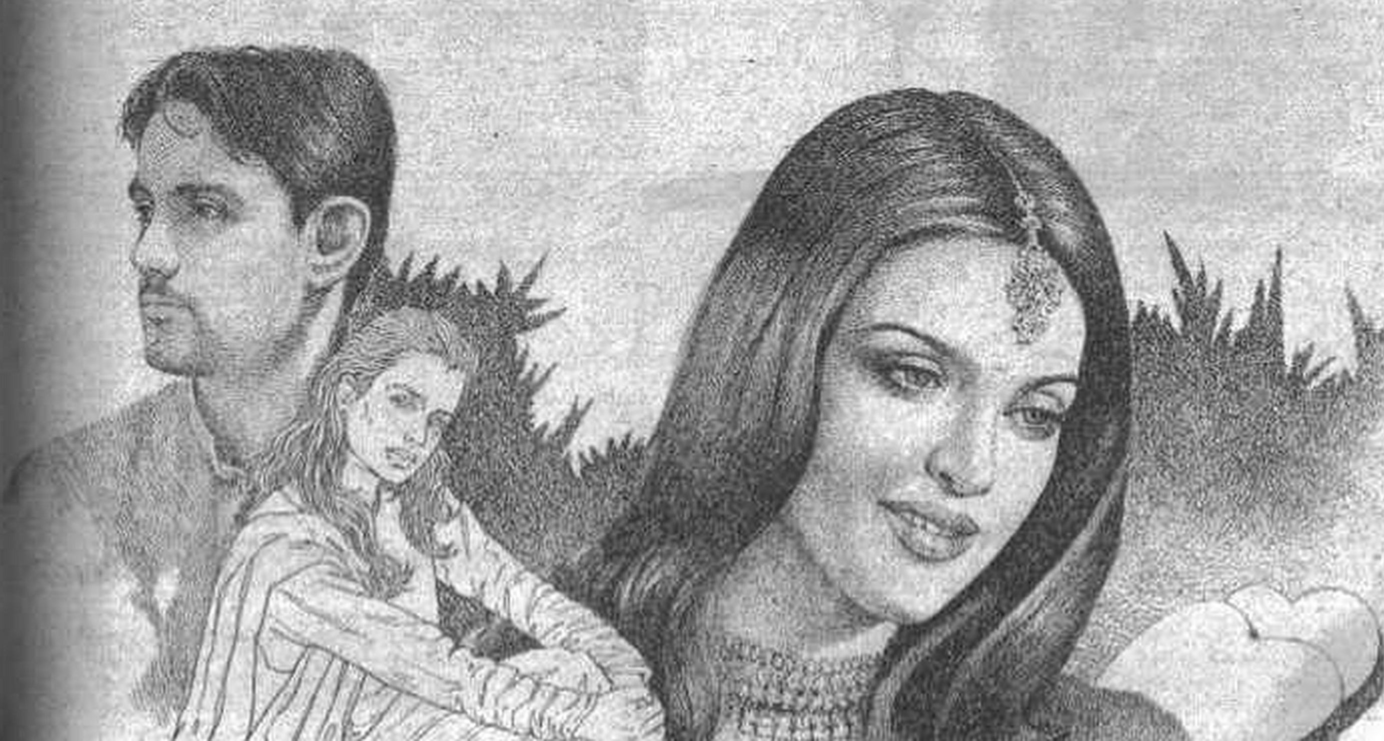

اس نے طویل سانس لے کر کتابیں بند کیں۔ رائٹنگ ٹیبل سیٹ کی۔ الماری سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے بالوں میں برش کیا اور لائٹ آف کرنے کے لیے آگے بڑھی اور پھر ہر بار کی طرح اس بار بھی اس کی نظر داہنی دیوار پر لگی اس پینٹنگ پر ٹھہری گئی۔ اس تصویر میں منظر کشی بہت عجیب سی تھی' ماحول کسی قدر پراسرار اور ایک بے نام سا خوف! اریبہ کی نظر جب بھی اس پر پڑتی تھی وہ ایک سرد لہر سی خود میں دوڑتی محسوس کرتی۔

اسے یاد تھا کہ جب گھر کو نئے سرے سے سیٹ کیا گیا تھا تو یہ پینٹنگ کہیں سے تحفتاً" آئی تھی۔

شومئی قسمت کہ وہ اریبہ کے کمرے میں سجادی گئی۔

"تصویر میں وسیع و عریض صحرا دکھایا گیا تھا جس پر کالی سیاہ رات نے اپنا بسیرا کر رکھا تھا' چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا اور چاندنی میں صحرا کی ریت چمک رہی تھی۔ چمکتی ہوئی اس ریت کے میدان کے عین وسط میں ایک گھڑسوار تھا جو اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا رہا تھا' گھوڑے کے اگلے پیر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے' گھڑسوار کا لباس بھی سیاہ تھا اور مستزاد اس نے اپنا چہرہ بھی سیاہ ڈھاٹے سے ڈھکا ہوا تھا جو کہ تصویر کی کشش اور خوف میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔ بہت مدھم سے الفاظ میں نیچے

"Going to revange" (انتقام کے لیے روانہ) درج تھا۔

اس وقت بھی وہ عجیب سی کیفیات کا شکار ہو کر لائٹ آف کر کے بستر پر آ گئی۔ پتا نہیں وہ گھڑسوار کون سا بدلہ لینے کہاں جا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ کب نیند کی وادی میں اتری اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔

* * *

سیاہ تارکول کی سڑک پر برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی بی ایم ڈبلیو نے اپنا رخ کچی سڑک کی طرف موڑا تو ٹائر ایک لمحے کو زور سے چرچرائے' پھر انجن غرایا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی حویلی کی طرف بڑھنے لگی۔

شام کا دھندلکا ہر سو چھا رہا تھا۔ کچے رستے دو رویہ لگے بڑے بڑے سفیدے اور شیشم کے درخت خاموش اور ساکت کھڑے تھے۔ ماحول اس وقت صرف پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ سائے لمبے ہوتے ہوئے بتدریج سمٹ رہے تھے۔ آخر کار گاڑی سرخ و سیاہ امتزاج سے مزین ماربل سے بنی حویلی کے سامنے رک گئی۔ چوکیداروں نے تیزی سے گیٹ کے پٹ وا کیے۔ گاڑی سیاہ بجری کی روش پر چلتی ہوئی پورٹیکو کی طرف بڑھ گئی۔ نثار نے تیزی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"سلام شاہ سائیں!" اس نے ادب سے سلام کیا۔

سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس کندھوں پر اجرک اوڑھے "شاہ فضل" نے جواباً" صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نثار کے قدم اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپ رہے تھے۔

"حویلی میں سب خیریت ہے؟" اس نے اپنے مخصوص بارعب اور گرجدار لہجے میں پوچھا۔

"جی سائیں! سب خیریت ہے۔"

"شاہ فیصل کدھر ہے؟" اس نے اگلا سوال داغا۔

نثار ایک لمحے کو گڑبڑایا۔

"وہ... وہ سائیں! اپنے دوست ملک سے ملنے گئے ہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

شاہ فضل کے برق رفتار قدم تھم گئے۔ اس کی پیشانی پر ایک شکن آ گئی۔

"تم نے اسے میرے آنے کے بارے میں بتایا تھا؟"

"جی سائیں!" نثار نے نظریں جھکا لیں۔

"میرا پیغام دیا تھا؟"

"جی سائیں!"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے طویل سانس لے کر قدم زنان خانے کی طرف موڑ دیے۔

نثار جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتا واپس مڑ گیا۔

بی بی جان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکال کر شاہ فیصل کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہاں سائیں! کدھر ہو؟ ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے حویلی میں' پتا چلا' تمہارے لیے اپنے ویر (بھائی) سے اہم اپنے سجن ہیں اسی لیے تو ایک ماہ بعد ملنے کی بے تابی صرف اپنے متروں (دوستوں) سے تھی ہم سے نہیں۔" اس کے تحکم بھرے لہجے میں طنز کی آمیزش صاف نظر آتی تھی۔

"نہ... نہ... سائیں!"

"اب کیا فائدہ؟ ثبوت تو تم نے دے دیا کہ تمہارے لیے کون "اہم" ہیں؟" اس نے تلخ لہجے میں "اہم" پر زور دیا۔

"ہم سب سمجھتے ہیں رشتوں اور دوستوں کا مقام۔ تم ہمیں مت سکھاؤ۔ تم حویلی آجاؤ۔ باقی بات پھر کریں گے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

اس کی چمک دار سیاہ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

"اس کے بارہا سرزنش کرنے کے باوجود بھی شاہ فیصل اور منصور ملک کی دوستی بڑھتی گئی تھی۔ ملک خاندان سے ان کے تعلقات کچھ خاص بہتر نہ تھے مگر کوئی دشمنی بھی نہیں تھی محض ایک لاتعلقی تھی جو بری طرح دونوں خاندانوں کے درمیان حائل تھی۔ شاہ فیصل اور منصور ملک کی بڑھتی ہوئی دوستی میں اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نظر نہ آتا تھا مگر شاہ فضل کی بات رد کرنے کی ہمت کس میں تھی؟ اس نے صاف لفظوں میں شاہ فیصل کو منصور ملک سے تعلقات ختم کرنے کو کہا تھا مگر شاہ فیصل نے صریحاً" اسے نظرانداز کر کے اپنی "حکم عدولی" کی سزا کو گویا مزید سخت کر دیا تھا۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے اور ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

* * *

تاحدِ نظر پھیلے مالٹے اور سیب کے باغات کے درمیان کچے رستے پر تیزی سے دوڑتی گھوڑا گاڑی میں سے ایک ذی نفس چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا اور سیدھا مالٹے کے درختوں کے جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔ اس کے آشنا انداز اسے یہاں کا رہائشی ظاہر کرتے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان جگہ بناتا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے چوکنا انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ جیب میں کسی چیز کی موجودگی کا یقین کیا اور اپنے لیے ایک مناسب مورچہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی نگاہیں ایک قدرے نیچے کو جھکے اور پھیلے ہوئے درخت پر جا کر رک گئیں۔ اسے یقین تھا وہ دونوں یہیں آئیں گے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم
مریم عزیز
قیمت 250 روپے

ننگے پاؤں
نگہت سیما
قیمت 250 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

اس نے اپنی پوزیشن سیٹ کی اور عقابی نگاہ سے چاروں طرف کا جائزہ لیا، پھر اپنے کان کچے رستے کی طرف لگا دیے جہاں سے جیپ کی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ جوں جوں آواز قریب آتی جا رہی تھی اس کے اعصاب مزید تنتے جا رہے تھے۔ دل کی دھڑکن بھی بڑھی ہوئی سی لگ رہی تھی اور آخر کار وہ جیپ اس کے قریب سے گزر کر قدرے آگے جا کر ترچھی ہوئی اور پھر رک گئی۔

* * *

"منصور! یار کدھر ہو تم؟"

"شاہ سائیں! میں اپنے گیٹ پر پلکیں بچھائے آپ کا منتظر ہوں۔" منصور نے چبھتے ہوئے لہجے میں طنز کیا۔

جواباً فیصل نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔

"فکر مت کرو بابا! ہم تمہاری طرف آ رہے ہیں بلکہ جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ ہم اپنی رعایا کی صدا خالی نہیں جانے دیتے بابا!" فیصل نے ہنسی روکتے ہوئے خالص وڈیرے کے سے انداز میں کہا۔

"مہربانی سائیں! آپ تشریف کا ٹوکرا لے ہی آئیں ورنہ......" منصور نے دھمکاتے ہوئے فون بند کیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

دونوں کا آج شام شکار کا پروگرام تھا۔ فیصل کو اسے پک کرنا تھا، جب ہی منصور پچھلے آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا، مگر فیصل کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ کئی بار تو اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی گاڑی لے کر نکل جائے، پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اسی کشمکش کے دوران فیصل کی کال آ گئی۔ کچھ دیر بعد گیٹ پر جیپ کی آواز سنائی دی، وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ فیصل دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔ منصور بڑھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا، پھر مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

"خیریت! آج بڑی خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں جناب سے۔"

"کچھ نہیں یار! ایسے ہی دل چاہا تھا۔" فیصل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی دل ہے، کبھی بھی چاہ سکتا ہے اور کچھ بھی چاہ سکتا ہے۔ اب چلیں؟" منصور نے کہا۔

دونوں جیپ کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی جیپ تیزی سے کچے رستے پر دھول اڑاتی سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔

تب ہی نہ جانے کیا ہوا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

فیصل نے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی، پھر دروازے کھول کر دونوں نیچے اتر آئے۔ فیصل جیپ کا بونٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ تب ہی گولی چلنے کی آواز پر منصور نے چونک کر دیکھا۔ ارد گرد کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے اپنا روسی ساختہ بریٹا نکال لیا اور فائر کیا لیکن گولی نہیں چلی۔

"مجھے لگتا ہے اس کے ٹرائیگر میں کوئی مسئلہ ہے۔" منصور نے ریوالور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی چیک کر لیتے ہیں۔" فیصل اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر دیکھنے لگا۔

"اب اسے چلا کر دیکھو۔" منصور نے آسمان کی طرف اس کا رخ کر کے ٹرائیگر دبایا مگر بے سود۔ منصور ریوالور دیکھ رہا تھا اور پھر پتا نہیں کیا ہوا فضا ایک دم فائر کی آواز سے گونجی۔ فیصل کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا، اس کے سینے سے خون کا فوارہ سا پھوٹا تھا۔ منصور نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ فیصل کا وجود لرزا اور پھر پوری قوت سے کچے میں جا گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا جان دار وجود پل دو پل میں خاک کے ڈھیر میں مل گیا تھا۔

درختوں پر پھڑپھڑاتے پرندے زور و شور سے چیخ رہے تھے۔ منصور پھٹی پھٹی نگاہوں سے فیصل کو دیکھ رہا تھا جس کی ساکت آنکھوں میں حیرت گویا جم کر رہ گئی تھی۔ خوف نے پوری شدت سے اس پر حملہ کیا۔

"میں نے...... میں نے...... نہیں مارا......"

وہ پلٹ کر پوری طاقت اور وحشت سے بھاگا تھا۔

سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کے عین وسط میں کھڑی جیپ اور اس کے ساتھ پڑی فیصل کی لاش کے بالکل ساتھ وہ ریوالور گرا پڑا تھا جس پر منصور کی انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ فضا میں مالٹوں کی خوشبو کے ساتھ ایک بو بھی پھیل رہی تھی اور وہ تھی موت کی بو، جو کہ فیصل کے خوشبو دار وجود سے اٹھ رہی تھی۔

* * *

شاہ محمود کے دو بیٹے تھے۔ "شاہ فضل" اور "شاہ فیصل"۔ ان کا شمار گاؤں کے وڈیروں میں کیا جاتا تھا۔ شاہ محمود پنچائیت کے پنچ تھے اور اپنی انصاف پسندی کی بنا پر پورے گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اپنی زمینیں اور باغات تھے۔ لاہور میں تین فیکٹریاں چل رہی تھیں۔ "شاہ فضل" نے ایگری کلچر میں ماسٹرز کیا تھا۔ اس کی ذات کی سب سے نمایاں شناخت تھی اس کا غرور۔

چلتا تو یوں جیسے سلطنت فتح کر لے گا۔ بولتا تو یوں جیسے اس کے سامنے اس کی حقیر ترین رعایا کھڑی ہو۔ دیکھتا تو یوں جیسے آنکھوں سے روح کھینچ لے گا۔ اس کی شخصیت کو اگر دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا تو شاید یہی تھا۔ "مجسم غرور۔" اس کا غصہ اتنا سخت اور تیز تھا کہ بعض دفعہ تو شاہ محمود بھی گھبرا جاتے تھے۔

اس کے بعد "شاہ فیصل" تھا۔ ایم بی اے پارٹ ون کا اسٹوڈنٹ، بلا کا شریر، بذلہ سنج اور زندہ دل۔ اکڑ تو جیسے اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ صحیح معنوں میں وہ "شاہ فضل" کی الٹ تھا۔

"فیروز ملک" کا شمار بھی علاقے کی با اثر شخصیات میں کیا جاتا تھا مگر وہ گاؤں کے اندرونی معاملات سے ہمیشہ لاتعلق اور بے خبر رہے تھے۔ ان کے دو ہی بچے تھے "منصور ملک" اور "اریبہ ملک"۔ منصور ان کے ساتھ لاہور والی فیکٹری میں ہوتا تھا جبکہ اریبہ نے اے میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا۔ انیس سالہ اریبہ میں جیسے منصور کی جان تھی۔ وہ بہن سے بے تحاشا پیار کرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی تھا کہ اس نے سب سے باقاعدہ ٹکر لے کر اسے آگے ایڈمیشن دلوایا تھا، گھر میں کوئی راضی نہ تھا۔ ان کی فیملی میں لڑکیوں کو اتنا آگے پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا مگر منصور سب کے آگے ڈٹ گیا تھا اور یوں اس وقت وہ تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

* * *

پورے علاقے میں ایک طوفان سا آیا ہوا تھا اور وہ تھا "شاہ فیصل" کی موت کا طوفان، جس نے حویلی کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں، شاہ فضل تو بپھرا شیر بنا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو منصور ملک سمیت اس کے پورے خاندان کو آگ لگا ڈالتا مگر یہ شاہ محمود کی کمال قوت برداشت تھی، جس نے ابھی تک اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز نہ ہونے دیا تھا۔ آج شاہ فیصل کی موت کو تیسرا دن تھا۔ پنچائیت بیٹھ چکی تھی۔ تمام ثبوت اور گواہیاں منصور ملک کے خلاف تھیں، یقیناً" وہ سزا کا مستحق ٹھہرتا مگر تب...... جب وہ موجود ہوتا۔ وہ اسی دن اسی وقت فرار ہو چکا تھا۔ تاحال اس کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ "شاہ فضل" کے آدمی پاگل کتوں کی مانند ہر طرف اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے مگر وہ ہنوز لاپتا تھا۔ ایک اندازہ یہ بھی لگایا جا رہا تھا کہ لازماً" وہ علاقہ غیر کی طرف نکل گیا تھا۔

حویلی کے مردان خانے میں اس وقت گرما گرم بحث چھڑی ہوئی تھی۔ تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ پنچائیت کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔

"یہ ناممکن ہے بابا سائیں!" شاہ فضل کی دھاڑ گونجی تھی۔

"خون کو ٹھنڈا رکھو سائیں! یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور یاد رکھو ایسے کتنے ہی معاملات کے فیصلے ہم نے بھی ایسے ہی سنائے تھے۔" بابا سائیں کا لہجہ پرسکون تھا۔

"آپ کا مطلب ہے میں اپنے بھائی کے خون کی قیمت لے لوں۔ بے غیرت بن جاؤں؟" وہ پاگل ہونے کو تھا۔

"دوسرا راستہ زیادہ بہتر ہے، تم فیروز ملک کی بیٹی سے

نکاح کرلو۔" اس کے چچا شاہ فرقان نے کہا۔

"دیکھو فضل بیٹا! مجرم فرار ہوچکا ہے۔ اس لیے فیصلہ یہی کیا گیا کہ خون بہا کی رقم یا لڑکی۔ آگے جو تم مناسب سمجھو۔" اس بار اسے سمجھانے والے ماموں فراز تھے۔

"میرے فیصل کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ میں اس کی قیمت لوں؟" وہ غرایا تھا۔ آنکھوں میں پھیلی سرخی اس کے رت جگوں اور غضب کی غماز تھی۔

"ہاں... لڑکی پر سمجھوتہ ہوسکتا ہے۔" وہ لب بھینچتے ہوئے بولا۔

سب نے ایک نامعلوم سی تسکین بھری سانس لی۔ تاہم اب ایک نئی بحث چھڑ چکی تھی۔

دوسری طرف "ملک ہاؤس" پر بھی ایک قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ فیروز ملک کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ پنچائیت کا فیصلہ سن کر آگئے تھے مگر جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ وہ رقم کا مطالبہ ہرگز نہیں کریں گے۔ وہ شاہ محمود کے خاندان کو جانتے تھے۔ ان کی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ رقم قطعاً" قبول نہ کریں۔ ویسے بھی ان کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ جیسے ہی فیروز ملک دوسری طرف سوچتے ان کے دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگتیں۔ کیونکہ اس طرف ان کی اکلوتی نازوں پلی بیٹی اربیجہ تھی "ملک ہاؤس" میں داخل ہوکر انہوں نے کس حوصلے سے سب کو پنچائیت کا فیصلہ سنایا تھا مگر پھر جیسے ضبط کی حد ختم ہوگئی تھی۔ وہ ڈھے سے گئے اور فرزانہ ملک تو جیسے ساکت سی ہوچکی تھیں۔

"میری بچی کا کیا قصور ہے ملک صاحب؟" وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

فیروز نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں چرا گئے۔ اگلی صبح ان کے شکوک صحیح ثابت ہوگئے تھے۔ حویلی سے فیصلہ آچکا تھا۔

اسی شام اربیجہ ملک کو شاہ فضل کے نکاح میں دے دیا گیا۔ اربیجہ نے چھوٹے سے بیگ میں اپنے چار جوڑے رکھے۔ ایک ساکت اور ضبط سے بھری نگاہ اپنی کتابوں پر ڈالی تھی' جن میں سے کچھ پر تو اس نے ابھی اپنا نام تک نہ لکھا تھا' پھر اس کی نظر دیوار پر لگی اس تصویر پر پڑی۔ اس نے اسے دیوار سے اتارا اور اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

رخصت کرتے ہوئے اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ سمجھ لے' اس نے اپنی زندگی بھائی کے اوپر صدقہ کردی۔

* * *

آج اسے حویلی میں آئے دوسرا دن تھا۔ اس نے ابھی تک شاہ فضل کو نہیں دیکھا تھا۔ آج ملازمین کی پھرتیاں اور حویلی میں ہونے والی ہلچل بتارہی تھی کہ وہ واپس آرہا تھا۔

حویلی میں سب کا روّیہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ بی بی جان نے اس سے مختصر سی بات کی تھی اور اسے کمرے میں جانے کو کہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب شام کی تیاری ہونے لگی تو وہ خاموشی سے بی بی جان کے پاس آبیٹھی جو زیرِ لب تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھیں۔

"فضل پہنچ چکا ہے۔" انہوں نے اسے بتایا۔

ایک نامعلوم سرد لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ پتا نہیں وہ کتنا غصیلا اور تند خو تھا' شاید اتنا جتنا اس نے سب سے سنا تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ شاہ فیصل سے بے حد پیار کرتا تھا۔ جان چھڑکتا تھا اس پر اور اب کیا کرے گا وہ اس کے ساتھ؟

"تم کچن میں جاکر دیکھو' کھانا تیار ہے۔" بی بی جان نے اسے اس کی سوچوں سے نکالا۔

وہ سر جھٹک کر اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سب انتظام دیکھ کر واپس آتے ہوئے وہ یکدم رک سی گئی۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ بی بی جان کی آواز کے ساتھ ایک مردانہ آواز' جو یقیناً "شاہ فضل کی تھی۔ بھاری' بارعب' پُرتاثر' اربیجہ کو اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہوا۔

وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف آکر اس نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا تھا۔

پھر ملازمہ اسے کھانا دینے آئی' مگر اس نے انکار کردیا' اس کی بھوک پیاس یک لخت ختم ہوچکی تھی۔ شام کے تھال میں رات کے سکے گرنے لگے۔ آوازیں بتدریج مدھم ہوتی گئیں اور روشنیاں گل۔ جب ہلکی سی دستک کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔ بڑھ کر دروازہ کھولا تو ندرت کھڑی تھی۔

"چھوٹی بی بی! آپ کو شاہ سائیں نے بلایا ہے۔" اربیجہ نے ہراساں ہوکر اس کی شکل دیکھی۔

"کون سے... کون سے شاہ سائیں نے؟" اربیجہ نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ ندرت نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔

"فضل سائیں نے بی بی!" اس نے تصحیح کی۔

اربیجہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"کہاں بلایا ہے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔ آئیں میں آپ کو چھوڑ آؤں۔" اربیجہ نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ بمشکل اپنی گرم شال کو اپنے گرد لپیٹا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

ندرت اسے مردان خانے میں لے آئی۔ پھر ایک منقش دروازے کے سامنے رک گئی۔ ہلکا سا بجایا اور دھیمی مگر مؤدب آواز میں بولی۔

"سائیں! میں چھوٹی بی بی کے ساتھ ہوں۔"

"آجاؤ۔" اس کی بھاری' گمبھیر آواز گونجی۔

ندرت نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ اربیجہ اس کے پیچھے تھی۔ کمرہ کیا تھا پورا شیش محل تھا۔ اتنا خوب صورت' اتنا ویل فرنشڈ۔ اربیجہ دنگ سی تھی۔

"کوئی خدمت سائیں؟" ندرت نے پوچھا۔

"نہیں' تم جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔

ندرت خاموشی سے مڑ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔

اربیجہ بمشکل لرزتی ٹانگوں کا بوجھ سنبھالے نظریں زمین پر گاڑے کھڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ابھی گر جائے گی۔

سرخ شنیل کے لحاف میں نیم دراز وہ بڑے سکون سے اس کے چہرے کے اڑتے رنگوں کو ملاحظہ کررہا تھا۔ سیاہ گرم شال اور سرخ پلین لینن کے سوٹ میں وہ دمک رہی تھی۔ اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں وحشت اور خوف تھا۔ چہرے سے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگ رہی تھی۔ شاہ فضل کی نجانے کون سی حس کو تسکین پہنچی تھی۔ اس کی نظریں اربیجہ کے سراپے پر جم کر رہ گئی تھیں اور نظروں کی تپش سے وہ کچھ اور زرد ہوگئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس کی سرد آواز گونجی۔

"اربیجہ۔" وہ بمشکل حلق سے آواز نکال کر بولی۔

"کیا کرتی ہو؟" اگلا سوال ہوا۔ اربیجہ کو لگا وہ کسی تفتیشی افسر کے سامنے کھڑی ہو۔

"پڑھتی ہوں۔" اس نے کہا پھر یک لخت اپنے غلط جواب کا ادراک ہوا۔ "پڑھتی تھی۔" اس نے فوراً" کہا۔

شاہ فضل نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"کیا پڑھتی تھیں؟"

"بی اے میں ایڈمیشن لیا تھا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔

"کب؟"

"ایک ماہ پہلے۔" اس کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ اس کا دل چاہا کاش وہ وہاں سے بھاگ سکتی۔

"ماں باپ تو تمہارے بڑے خود غرض نکلے۔ بیٹے کے بدلے تمہیں پیش کردیا۔" اس نے حقارت سے کہا۔

اربیجہ کے سینے میں ایک انّی سی گڑ گئی۔ اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اس بات کا تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

"یہاں آؤ۔" اس نے حکم دیا۔

اریجہ کے قدموں سے زمین سرکی تھی۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ اپنی پوری شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ۔ سیاہ شلوار سوٹ میں آستینیں کہنیوں تک موڑے، ٹانگوں پر لحاف ڈالے، چمک دار سیاہ آنکھیں اور کھڑی ناک، گھنی مونچھوں تلے عنابی لب باہم بھینچے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں نے جیسے اسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلتی بیڈ کی طرف بڑھنے لگی۔

"اتنا تو تم جانتی ہوگی کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو کیا حیثیت دی جاتی ہے؟" اس نے سفاکی سے کہا۔

"جی نہیں۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"جان جاؤ گی۔" وہ تلخی سے ہنسا تھا۔

"مجھے نہیں پتا بی بی جان نے تمہیں اس حویلی میں کیا حیثیت دی ہے مگر یہاں تمہاری حیثیت وہ ہوگی جو میں متعین کروں گا۔" وہ رعونت سے بولا تھا۔

اریجہ کا سانس جیسے سینے میں ہی اٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ بالکل اس کی قسمت کی طرح۔۔۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ چادر اتر گئی، دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اریجہ کا جی چاہ رہا تھا، وہ زور زور سے روئے، ماں کو پکارے، اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں اور دبی دبی چیخیں شاہ فضل کو کتنی تسکین پہنچا رہی تھیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ وحشی تھا اور اس کی وحشت اور بربریت سہتے ہوئے وہ ادھ موئی سی ہو رہی تھی۔ وہ اس سے اتنی گندی زبان بول رہا تھا کہ اریجہ کا دل چاہا کاش وہ اپنے کان بند کر سکتی۔ روتے گڑگڑاتے ہوئے اس نے کتنی بار اس سے رحم کی بھیک مانگی تھی۔

"رحم شاہ سائیں۔۔۔ رحم۔۔۔" وہ مر رہی تھی، جواباً الٹے ہاتھ کا ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر پڑا تھا۔ اریجہ نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ گھلتا ہوا محسوس کیا تھا۔

"تیرے بھائی نے کیا تھا؟" وہ غرایا تھا بالکل کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند۔

وہ چیخ اٹھی تھی کہ بات اب برداشت اور ضبط کی حد سے نکل چکی تھی اور اس کی ہذیانی چیخیں سن کر جیسے وہ اور بھی درندگی پر اتر آیا تھا۔ درد کی آخری حد کو چھوتے ہوئے اس نے کب حواس گنوائے، اسے خبر نہ ہوئی تھی۔

* * *

آؤ جانچ لیتے ہیں
درد کے ترازو پر
کس کا غم کہاں تک ہے؟
شدتیں کہاں تک ہیں
کچھ عزیز لوگوں سے
پوچھنا تو پڑتا ہے
آج کل محبت کی
قیمتیں کہاں تک ہیں؟

اس کی آنکھ پتا نہیں کون سے احساس سے کھلی تھی۔ چند لمحے وہ بے حس و حرکت چھت کو گھورتی رہی، پھر حواس بیدار ہوتے ہی اسے بے پناہ گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ وہ اس کے پاس ہی تو تھا۔ یوں کہ وہ اس کے دائیں بازو اور دائیں ٹانگ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس کی سانس مزید رکنے لگی۔ یکلخت رات کے مناظر اس کے ذہن کے پردے پر لہرائے، خوف کی ایک سرد لہر تھی جو اس کو پسینے میں نہلا گئی۔

"یا اللہ! میں زندہ ہوں۔۔۔ ابھی تک۔۔۔ کیوں ہوں میں زندہ۔۔۔ کیا اتنی حقارت۔۔۔ اتنی ذلت سہنے کا حوصلہ تھا مجھ میں۔۔۔ کیا میرے اعصاب اتنے مضبوط ہیں؟ یا پھر۔۔۔؟ وہ سب جو اس شخص نے میرے ساتھ کیا ہے، کیسے سہہ لیا میں نے؟ وہ سب گالیاں جو اس نے مجھے دی ہیں۔۔۔ کیسے سن لیں میں نے؟ میں مر کیوں نہ گئی۔ اتنی وحشت، ایسی درندگی کیسے جھیل گئی میں؟ کیا میں اتنی حوصلہ مند ہوں؟" وہ حیران تھی، بے حد حیران۔

اتنی تذلیل اور ایسی بے بسی!
اتنی سفاکی اور جنون!

اسے اپنے گرد لپٹا اس کا بازو کسی ناگ کی مانند لگا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہر ہر عضو میں بھر جانے والی اذیت اس کی رگ جاں کو توڑ رہی تھی۔ کتنے بے آواز آنسو اس کے گالوں سے بہتے، بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

سچ کہا تھا شاہ فضل نے۔ حیثیت کا تعین حقیقتاً ہو چکا تھا۔ کیا حیثیت دی گئی تھی اسے؟ شاہ فضل نے ایک رات میں ہی عملاً" اپنے رویے سے اسے سمجھا دیا تھا۔

"میرے باہر جنگل تھا
اور میرے اندر آگ
آگ نکالوں
سب جل جائے
آگ چھپا لوں
خود جل جاؤں"

* * *

کتنے ڈھیر سارے دن بیت گئے۔ اریجہ کو یاد نہیں تھا، اس نے دنوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا یا شاید اس قید خانے میں وقت کے شمار کا تصور ہی نہ تھا۔ زندگی عین اس انداز میں بسر ہو رہی تھی، جس طرح شاہ فضل چاہتا تھا۔

اس کی حیثیت کا تعین ہونے کے بعد وہ تمام مراعات سے بھی مستثنیٰ قرار دے دی گئی تھی۔ اس وقت وہ بالکل اسی انداز میں رہ رہی تھی جیسے دیگر خادمائیں رہتی تھیں۔ ان سب کی طرح وہ صبح پانچ بجے اٹھ جاتی۔ کچن کا سارا کام اس کے ذمہ تھا۔ وہ برتن صاف کرتی، دودھ ابالتی، آٹا گوندھتی اور بوقت ضرورت سبزی وغیرہ کاٹ لیتی تھی۔ سالن بنانا ندرت کی ذمہ داری تھی۔

اس کے علاوہ شاہ فضل کی ساری ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ وہ ملازماؤں کے ساتھ ہی کھاتی پیتی تھی یا پھر جو شاہ فضل کا بچا کھچا ہوتا۔ بالکل عام بلکہ کسی حد تک بدوضع کپڑے پہن لیتی تھی۔ سارا دن گدھوں کی طرح مشقت کرنے کے بعد اس کے پاس یہ حق بھی نہ تھا کہ وہ دو گھڑی لیٹ کر کمر سیدھی کر سکے۔ اسے رات کے کھانے کے برتن صاف کرنے ہوتے تھے اور اس کے ساتھ کچن بھی صاف کرنا ہوتا تھا۔ سونے کے لیے اسے بہرحال شاہ فضل کے کمرے میں جانا ہوتا تھا۔ یہ شاہ فضل کا حکم تھا جس سے سرتابی کی اسے مجال نہ تھی۔

* * *

"شاہ سائیں! کھانا۔" اس نے بڑی سی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور مدھم آواز میں کہا۔

وہ کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔

"جاؤ۔" اس نے سر اٹھائے بغیر حکم دیا۔

وہ خاموشی سے چلتی باہر آ گئی۔ کچن میں آ کر اس نے وہ ڈھیر برتن دھونے شروع کر دیے جن سے سارا سنک بھرا ہوا تھا۔ مسلسل کام کر کر کے اس کی کمر دکھ رہی تھی اور ٹانگیں جیسے بے جان ہو رہی تھیں مگر وہ بے حس بنی کام میں لگی رہی۔ احساسات جگا کر کرنا ہی کیا تھا۔ زندگی صرف درد و غم سے عبارت رہ گئی تھی۔ بے حسی نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو رہا تھا۔

وہ کام ختم کر کے باہر نکلنے کو تھی۔ اس کی نظر شاہ فضل کے کمرے سے واپس لائی گئی ٹرے پر پڑی، اس کی پلیٹ میں بچے ہوئے چاول موجود تھے۔ اسے ایک دم احساس ہوا، اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پیٹ میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار پلیٹ تھام کر نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری اور اس کے ساتھ ہی شاہ فضل کی صورت دروازے کے فریم میں دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حکم سائیں!" اس نے نظریں جھکا کر کہا، اب زندگی صرف ان ہی دو لفظوں پر محیط ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر کچن میں پڑی ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔

"کھانا کھاؤ۔" اگلا حکم ہوا۔ اربیجہ کے ہاتھ میکانکی انداز میں پلیٹ کی طرف بڑھ گئے مگر جانے کیوں ہر نوالہ حلق میں اٹک رہا تھا۔ آنسوؤں کا گولہ سا حلق میں پھنسا ہوا تھا شاید۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بڑے کروفر سے یوں بیٹھا تھا کہ اس کا دایاں پاؤں بالکل اربیجہ کے چہرے کے قریب تھا۔ اگر وہ ذرا سی حرکت کرتا تو لازما" اس کا پیر اس کے منہ پر جا لگتا۔ تذلیل کے احساس سے اربیجہ کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیوں وہ اس غیر انسانی سلوک کی عادی نہیں ہو پا رہی تھی۔ صرف چند نوالے لینے کے بعد اس نے ہاتھ روک لیا۔ خاموشی سے اٹھی، پلیٹ سنک پر دھری، پانی پیا اور ہاتھ دھونے لگی۔

"چائے بناؤ۔" اس کی سرد آواز گونجی تھی۔

وہ خاموشی سے کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گئی۔ چائے بناتے ہوئے اسے یاد آیا، نجانے کتنے دن بیت چکے تھے اسے اس نعمت سے لطف اندوز ہوئے، وہ چائے کی دیوانی تھی مگر یہاں تو دو وقت کھانا کھانا بھی ٹھیک سے یاد نہ رہتا تھا۔

چائے مگ میں انڈیل کر اس نے مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مسلسل اس پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ نجانے اب کون سی سزا سنائی جانے والی تھی۔

دو منٹ میں اس نے چائے ختم کرلی تھی مگ اسے تھما کر وہ اٹھ گیا، اربیجہ نے خاموشی سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس نے کپ دھو کر اسٹینڈ پر رکھا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ لباس تبدیل کرکے ایزی چیئر پر جھول رہا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے تم مظلوم ہو تمہارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے؟" اس کی بھاری پُر تحکم آواز میں سوال تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا، اسے مشکل میں ڈالنے والے سوالات کرتا تھا۔

اربیجہ نے اپنی لرزتی ٹانگوں پر بمشکل قابو پایا اور قدرے مستحکم لہجے میں بولی۔

"سچ تو یہی ہے۔"

"خوب تمہاری یہی بات اچھی ہے۔ تم کم بولتی ہو مگر خوب بولتی ہو۔" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

وہ غیر محسوس انداز میں سہم سی گئی۔

"تمہارے اس ذلیل بھائی کا پتا نہیں چل رہا۔ میرے آدمی چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ قوی خیال یہی ہے کہ وہ علاقہ غیر کی طرف نکل گیا ہے، مگر۔۔۔ وہ بچ نہیں پائے گا۔ جب تک اس کے ٹکڑے کرکے "ملک ہاؤس" میں نہیں بھجواؤں گا، سکون نہیں آئے گا۔" اس کے لہجے میں خون آشام درندے کی سی پھنکار تھی۔ ضبط کرتے کرتے بھی اربیجہ کی آنکھوں سے کئی آنسو لڑھک گئے۔

"رو کیوں رہی ہو؟" وہ مزید غضب ناک ہوا تھا۔

"آپ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟" وہ جیسے سراپا سوال بن گئی تھی۔

"تم خود کو بے قصور سمجھتی ہو؟" وہ دھاڑا۔ وہ لرز اٹھی مگر مضبوطی سے کھڑی رہی۔ آج تو وہ جیسے سارے حساب بے باق کرنے پہ تلی بیٹھی تھی، وہ کیوں سہے یہ ذلت، جب وہ بے قصور تھی۔

"منصور ملک نے میرے بھائی کو قتل کر ڈالا اور تم۔۔۔ تمہیں لگتا ہے تم بے قصور ہو؟" وہ اس کا بازو دبوچتے ہوئے غرایا تھا۔

"میں نے تو نہیں کہا تھا منصور لالہ سے کہ وہ۔۔۔" ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی، جب شاہ فضل کا ہاتھ برق رفتاری سے اس کے گال پر پڑا۔ وہ درد کی شدت سے چلا اٹھی۔

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ تمہاری اتنی جرأت کہ میرے سامنے بلند آواز میں بولو؟ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ تم۔۔۔" وہ جنونی ہو کر اس پر جھپٹا اور اسے ٹھوکروں پہ رکھ لیا، وہ بلند آواز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے پیروں کی پے در پے پڑنے والی ضربات نے اسے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ وہ رو رہی تھی، معافیاں مانگ رہی تھی مگر وہ جیسے ہر صدا سے نا آشنا ہو چکا تھا۔

"ماریں، مجھے جان سے مار ڈالیں۔ مجھے مارنے سے اگر آپ کا بھائی واپس آسکتا ہے تو میری جان بھی لے لیں۔" وہ بلند آواز سے روتے ہوئے بولی، وہ ایک دم رک گیا۔ چند لمحے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا رہا پھر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھی۔

"تمہیں مارنے سے میرا بھائی تو واپس نہیں آئے گا، مگر میرے سینے میں لگی آگ پر چند چھینٹے ضرور پڑیں گے۔" وہ سفاکی سے بولا۔

میرے لیے یہ سانسیں بھی
اتنی مشکل کیوں ہیں؟
میری آنکھوں کے آگے
اتنی دیواریں کیوں ہیں؟
میرے پیروں میں اتنی
زنجیریں کیوں ہیں؟
میرے ماتھے پر ایسی
تقدیریں کیوں ہیں؟

وہ جانتی تھی اس کے لیے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ خوشی سے یا ناخوشی سے، بہرکیف اسے اس برزخ میں جلنا تھا، اس کے لیے کوئی روزن نہ تھا، اس کے لیے کوئی ہمدرد یا مسیحا نہیں آئے گا، اسے یہ یقین کرلینا چاہیے۔ حویلی کے دیگر افراد یکسر بے پروا ہو چکے تھے۔ بی بی جان سمیت اور اگر اسے اس طرح ہی زندہ رہنا تھا، اتنی ہی تذلیل و حقارت کے ہمراہ تو وہ زبان چلا کر اپنی سزا کو سخت کیوں کر رہی تھی۔ کیوں چپ چاپ سولی پر نہیں چڑھ جاتی کہ جب مقدر یہی تھا۔ اسے یاد تھا۔ اس نے کبھی "ملک ہاؤس" میں کچن کا کوئی کام نہ کیا تھا، اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی، آگے پیچھے ملازمین کی فوج ہوتی تھی اور آج تقدیر نے اس سے کیسی دغابازی کی تھی۔ وہ حالات کے اس رخ پر گنگ سی تھی۔ وہ تو بابا کی پری تھی جسے کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔ آج وہ شخص، جو کہنے کو اس کا شرعی شوہر تھا، اس کے سر کا سائیں تھا، کیسے جانوروں کی طرح پیٹتا تھا اسے، معمولی معمولی سی غلطیوں پر وہ اس کی کھال ادھیڑ ڈالتا تھا۔ وہ کیوں اپنی زندگی کو اتنا مشکل بنا رہی تھی؟ زندگی آسان بھی ہو سکتی تھی اگر وہ خاموشی کی عادت ڈال لیتی۔ اس رات فرش پر زخموں سے بھرے وجود کے ساتھ اس نے سوچا .اور ایک پختہ فیصلہ کرلیا۔

* * *

دن رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سورج طلوع اور غروب ہو جاتا۔ اربیجہ کی زندگی ان چیزوں سے ماورا ہو چکی تھی۔ اس کے لیے دن اور رات سب ایک جیسے تاریک تھے۔ کبھی کبھی اسے لگتا وہ تصویر اس کی زندگی کی بالکل حقیقی منظر کشی کر رہی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی ایک سیاہ صحرا میں پھنس گئی تھی، پیاس سے نڈھال ہو چکی تھی اور کیسی تھی یہ پیاس؟ رشتوں کی پیاس، محبتوں کی پیاس؟ جس کی طلب کی شدت سے اس کی زبان باہر نکل آئی تھی، اس کے پیچھے وہ گھڑ سوار بھی ویسا ہی تھا جیسا شاہ فضل تھا، انتقام میں اندھا، پاگل، نفرت کا زہر اس کے اندر انڈیلتا۔

تذلیل، بے حسی اور بے التفاتی نے اس کے وجود کی ساری شادابی کو نچوڑ ڈالا تھا۔ رنگت میں زردیاں کھنڈ گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد گہرے ہوتے حلقے اور پپڑی زدہ ہونٹ، وہ اربیجہ کا سایہ معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت وہ اور ندرت دونوں کچن میں شام کا کھانا بنا رہی تھیں۔

"ندرت!"

"جی اربیجہ بی بی!" وہ ادب سے بولی۔

"یہ اتنی ساری عورتیں بی بی جان کے پاس روز کیوں آتی ہیں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"دعا کے لیے۔" ندرت نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بیگم سائیں کی دعا بڑی قبول ہوتی ہے جی۔" ندرت نے عقیدت سے کہا۔

"اچھا... میں بھی ان سے ایک دعا کے لیے کہوں؟" وہ کچھ ہچکچا کر بولی۔

"کیوں نہیں بی بی؟ آپ کا تو حق ہے۔"

"حق؟ اونہہ...!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے باہر دیکھا بڑا سا صحن اب خالی ہو رہا تھا۔ بھیڑ بتدریج چھٹتی جا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بی بی جان کے پاس آبیٹھی۔ بڑی عقیدت سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"میرے لیے بھی ایک دعا کیجیے بی بی جان!" اس نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ دھرا اور کہا۔

"بول بیٹی!"

"میرے لیے دعا کیجیے بی بی جان! کہ اللہ تعالیٰ میری سانسیں مختصر کردے۔ اب اور جینے کی خواہش نہیں رہی۔" اس کی بند آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔

بی بی جان کو جھٹکا سا لگا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹی! زندگی تو رب کی نعمت ہے۔" انہوں نے اسے پیار سے جھڑکا۔

"بی بی جان! جب نعمت بوجھ لگنے لگے تو اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولی تھی۔

ندرت حیرت سے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی۔

وہ اٹھی اور چلتی ہوئی واپس کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اس بات سے بے خبر کہ ندرت خاموشی سے مردان خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ معمول کے کام نبٹا کر مردان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ دن کی مشقت اختتام پذیر ہو چکی تھی تو کیا ہوا رات کی تو باقی تھی۔ بس زندگی اب جہد مسلسل کا نام ہی تو رہ گئی تھی۔

وہ اندر داخل ہوئی تو وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

اریجہ خاموشی سے واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ جب لوٹی تو اس کے بدن پر سفید سلکی نائٹی تھی۔ لبوں پر بے حد چمک دار سرخ لپ اسٹک تھی اور بال شانوں کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

یہ اس کا حکم تھا، جس کی اسے ہر حال میں تعمیل کرنا تھی۔

وہ بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ اریجہ جھک کر اس کے پیروں پر لحاف پھیلانے لگی پھر پائنتی والی سائیڈ پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ سر جھکے ہونے کے باوجود بھی وہ شاہ فضل کی خود پر جمی نگاہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

"آج بی بی جان سے کیا بات ہوئی تمہاری؟" اس کی بھاری سرد آواز اریجہ کو پسینے میں نہلا گئی۔

اس کا رنگ اتنی تیزی سے زرد پڑا کہ شاہ فضل کو لگا، جیسے اس پر زرد رنگ کا پینٹ کر دیا گیا ہو۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے لب کپکپائے پھر باہم پیوست ہو گئے۔ اس نے سہمی ہوئی، ہراساں نگاہ اٹھا کر ایک نظر شاہ فضل کو دیکھا اور پھر فوراً" سر جھکا لیا۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں؟" اس کا لہجہ مزید سخت ہوا تھا۔ وہ ساری جان سے لرز گئی تھی۔

"وہ... وہ ندرت نے بتایا تھا کہ بی بی جان کی دعا بہت... بہت قبول ہوتی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے... میرے لیے بھی دعا کریں۔"

وہ رک گئی۔ آگے ہمت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"کیسی دعا؟"

"یہی... یہی کہ..." وہ پھر رکی مگر بتانا لازم تھا۔ "وہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری سانسیں مختصر کر دے۔" اس نے ہمت کر کے کہہ تو دیا تھا مگر اب دم سادھے اس کے رد عمل کی منتظر تھی۔

"بس اتنی سی خواہش ہے تمہاری؟" وہ حیرت سے بولا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نزدیک کر لیا۔

"یہ خواہش تو تمہاری، میں بھی پوری کر سکتا ہوں۔ دعاؤں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتا ہوں میں۔" اس کا ہاتھ اس کی گردن پر رینگنے لگا، اریجہ کی سانس رکنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا مگر وہ بے حس و حرکت رہی۔

"تمہاری ایک چیز بہت اچھی ہے، تمہاری فرماں برداری... مجھے یقین ہے، میں اگر تمہیں مار بھی ڈالوں تو تم مزاحمت نہیں کرو گی۔ ہے نا؟" وہ یقین چاہ رہا تھا۔

"جی سائیں!" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ پورا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"مجھے ایک بات کی خوشی ہے اریجہ! کہ تم اپنی زبان بہت کم استعمال کرتی ہو اور یہ تمہارے حق میں ایک پلس پوائنٹ بن جاتا ہے۔ جب تم حویلی آئی تھیں تو کافی بدتمیز تھیں۔ نہیں؟ اب تو کافی کچھ سیکھ چکی ہو۔" وہ دھیمے دھیمے اس کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔

وہ لب کچلتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کرتی ہلکان ہونے لگی۔

"اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے؟" ایک بار پھر ایک مشکل سوال کا پھندا اس کے لیے تیار تھا۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟" اس نے کہتے ہوئے اریجہ کو مزید اپنے قریب کر لیا۔

"پ... پتا نہیں..." اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

شاہ فضل نے لحاف اوپر کھینچا تو وہ مکمل طور پر لحاف میں چھپ گئی پھر پتا نہیں کیا ہوا، وہ اس کے فراخ سینے میں منہ چھپا کر شدتوں سے رو پڑی۔

"مت رویا کرو اتنا" اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔

اریجہ کی سسکیاں فوراً" مدھم پڑی تھیں۔ خود پر قابو پاتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کرنے لگی، مگر نیند کہاں؟؟؟

"اریجہ!" اس نے پکارا۔

"جی" وہ مدھم سا بولی۔

لحاف کھسکا کر شاہ فضل نے اس کا چہرہ دیکھا۔ رونے کے باعث آنکھیں متورم اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"کچھ نہیں، سو جاؤ۔" اب کی بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

اگلی صبح بہت چمکدار اور نکھری ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل آئی۔ لان میں جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ جالی کے دروازے کے پاس آبیٹھی، حالانکہ اسے بند کمروں سے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی، وہ تو "ملک ہاؤس" میں ہمیشہ اپنے کمرے کی — کی کھلی رکھتی تھی، اسی وقت ندرت اپنے آنچل میں ڈھیروں پھول سمیٹے اندر آئی۔ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

"کیا بات ہے بی بی! آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ ویسے ہی۔" وہ اٹھ گئی۔

"تم مجھے اتنے احترام سے مت بلایا کرو ندرت! میری حیثیت تو تم سے بھی گئی گزری ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!" ندرت حیران رہ گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" وہ واپس پلٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

آج شاہ فضل کو لاہور جانا تھا۔ اسے اس کو تیار ہونے میں مدد دینا تھی۔ وہ واپس مردان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں آئی تو وہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اس کا شانہ ہلایا۔

"شاہ سائیں! اٹھ جائیں۔ آپ کو لاہور جانا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ وہ تھوڑا سا کسمسایا پھر آنکھیں کھول دیں۔

"کپڑے نکال دو میرے۔" وہ لحاف پرے کرتا اٹھ بیٹھا۔

"جی! کیا پہنیں گے؟" وہ لحاف سمیٹتے ہوئے بولی۔

"شلوار سوٹ نکال دو۔" وہ واش روم کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

اریبہ سرہلاتی ہوئی الماری کی سمت بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کریم کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس براؤن واسکٹ پہنے لوٹا تو بالکل روایتی جاگیردار لگ رہا تھا۔ بے پناہ وجیہہ و شکیل، سیاہ گیلے بال ماتھے پر بکھرائے وہ واقعی غضب ڈھا رہا تھا، اریبہ چند پل اسے یک ٹک دیکھتی رہی، یہ سوچے بغیر کہ وہ بلا کا زیرک تھا، کیسے محسوس نہ کرتا، فوراً" پلٹا، اسے اپنی طرف محویت سے دیکھتا پا کر بڑے جان دار انداز میں مسکرایا۔

"بس، ہار بیٹھی ہو دل۔" وہ تمسخر سے ہنسا۔

اریبہ کے سینے میں جیسے کسی نے زہر آلود خنجر پیوست کر دیا۔ اس کا رنگ پہلے زرد ہوا پھر سرخ، وہ خاموشی سے چہرہ جھکا کر گیلا تولیہ اٹھانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی، بازو اس کی گرفت میں آ گیا۔

"جواب نہیں دیا تم نے میری بات کا؟" اس کے لہجے میں محظوظ ہونے والی کیفیت تھی۔ دروازے پہ دستک کی آواز سن کر اس نے اریبہ کا بازو چھوڑ دیا۔

اریبہ نے بے دردی سے ہونٹ کاٹے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ندرت اندر آ گئی۔

"سلام سائیں! صبح بخیر۔" اس نے کلیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور واپس مڑ گئی۔

"ناشتہ کریں گے؟" اریبہ نے موقع غنیمت دیکھ کر بات بدلی۔

"نہیں، چائے لے آؤ۔" وہ بھی مڑ کر بال بنانے لگا۔ اریبہ شکر کرتی باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے آئی، وہ دائیں ہاتھ سے مگ تھامے صوفے پر بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ اریبہ نے اس کے موزے نکالے اور زمین پر بیٹھ کر جوتے پہنانے لگی۔

"تمہارے والد صاحب کا فون آیا تھا۔" شاہ فضل نے جیسے اس کے سر پر بم پھوڑا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم بات کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔" اس نے موبائل اریبہ کی طرف بڑھایا۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

"نہ ۔۔۔ نہ نہیں ۔۔۔ مجھے نہیں کرنا بات۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا جنھوں نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی بیٹی کو داؤ پر لگا دیا۔" اس کا تنفس بے ترتیب تھا اور بڑی بڑی غلافی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

شاہ فضل نے لاپروائی سے شانے جھٹکے اور موبائل جیب میں ڈال کر اٹھ گیا۔

"فی امان اللہ" اریبہ نے آہستگی سے کہا۔ شاہ فضل کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بے اختیار پلٹا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اریبہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

پھر آہستگی سے اس سے الگ ہو گئی۔ شاہ فضل کے ہاتھ نے نرمی سے اس کے گال کو تھپتھپایا اور واپس مڑ گیا۔

وہ ساکت و صامت سی کھڑی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شاہ فضل تھا، اتنا نرم، اتنا مہربان؟ اس نے بے یقینی سے اپنے گال کو چھوا جو ابھی تک اس کے ہاتھ کے لمس سے دہک رہا تھا۔

* * *

اریبہ معمول کے مطابق رات کے کھانے کے بعد کچن صاف کر رہی تھی جب اس نے ندرت کو اندر آتے دیکھا۔

"تم یہاں اس وقت؟ کیا بات ہے؟" اریبہ نے حیرانی سے پوچھا، رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

ندرت نے اضطرابی انداز میں انگلیاں چٹخائیں اور پریشانی سے اسے دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے ندرت؟" وہ الجھ گئی۔

"وہ، اریبہ بی بی! آج فیصل سائیں کا جنم دن ہے۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا۔ اریبہ کو جھٹکا سا لگا۔

"کیا؟ شاہ سائیں کدھر ہیں؟" اس نے فوراً" پوچھا۔

"وہ، میں نے نا، ابھی ابھی انہیں فیصل سائیں کے کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔ آپ سے مجھے کہنا تھا کہ آپ خاموشی سے اپنے کمرے میں ہی سو جائیں۔ مردانے میں مت جائیے گا۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ازراہ ہمدردی کہا۔

"کیوں؟"

"وہ جی، انہیں آپ کو دیکھ کر پھر غصہ آ جائے گا۔" اس نے سمجھایا۔ اریبہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ کون سے غصے کی بات کر رہی تھی وہ؟

وہ غصہ، وہ طیش اور وہ اشتعال جسے جھیلتے ہوئے وہ اتنی سخت جان ہو گئی تھی کہ اسے خود حیرانی ہوتی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے تسلی دلائی اور پلیٹ کر سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ ندرت مطمئن ہو کر واپس مڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اریبہ نے ایک طائرانہ نظر کچن پر ڈالی اور لائٹ آف کر کے دروازہ بند کرتی باہر آ گئی۔

اس کے قدم مردانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اس نے شاہ فیصل کے کمرے، جو اس نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا، کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی شاہ فضل کھڑا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ مڑا اور اریبہ نے دیکھا اس کے ہاتھ میں فوٹو فریم تھا۔ غالباً" نہیں یقیناً اس میں شاہ فیصل کی تصویر تھی۔

اریبہ نے شاہ فضل کا چہرہ دیکھا اور لرز گئی۔ کتنا درد تھا اس چہرے پر، کتنا کرب! یوں جیسے کائنات کی ہر اذیت، روئے زمین کا ہر دکھ اور سات سمندروں کی پیاس اس کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ اس کی چمک دار آنکھیں کتنی کرب آمیز محرومی سے آویزاں تھیں۔ اس کی مغرور کھڑی ناک پہ کتنی بے بسی تھی۔ اتنا محروم اور اتنا پروحشت چہرہ! اریبہ کو لگا یہ چہرہ اس کا اپنا تھا۔ بالکل ایسا ہی تو تھا اس کا چہرہ! محرومیوں کی دھوپ میں اٹا، رشتوں کی پیاس میں بھٹکا ہوا۔

آہ!

ہم اپنے دلوں کو
اپنی اپنی مٹھیوں میں
اتنی زور سے جکڑ لیں
کہ شریانوں میں پھوٹنے والا کرب
یہیں کہیں گم ہو کر رہ جائے

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس کے مقابل آ کر ٹھہر گئی۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟ میری آگ کو بھڑکانے یا میرے احساس زیاں کا اندازہ لگانے کے لیے؟" وہ بہت ٹوٹے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"آج فیصل کا جنم دن ہے اگر ۔۔۔ اگر وہ ہوتا تو آج وہ بائیس سال کا ہو جاتا۔" اس کا لہجہ کتنا خالی تھا۔

"آپ بہت پیار کرتے تھے ان سے؟" وہ پتا نہیں کیوں پوچھ بیٹھی تھی۔

"ہاں۔ بہت پیار کرتا تھا میں اس سے ۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھو، دیکھو۔۔۔ اس کمرے میں ہر چیز میری پسند کی ہے۔ وہ میری پسند کو اولیت دیتا تھا۔ ہمیشہ جب حویلی آتا تو کہتا۔

"لالہ! آپ اب شادی کر لیں۔" اور میں ہر بار ہنس دیتا۔ میں کہتا۔

تم اپنا ایم بی اے پورا کر لو۔ پھر اکٹھے ہی کر لیں گے۔"

اور وہ فوراً" بدک جاتا۔ "میں ۔۔۔۔ میری کیوں؟" اور میں کہتا۔

"ارے بھئی! مجھے تمہارے بغیر کام کرنے کی عادت نہیں ہے نا! اور شادی کے لیے مورل سپورٹ تو مجھے تم ہی سے ملے گی، جب مجھے پتا چلے گا کہ قربان گاہ میں صرف میں ہی نہیں تم بھی ہو۔۔۔"

وہ آگے سے بس ہنستا جاتا اور میں جو کبھی بلند آواز میں ہنسنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے آنے پر یہ حویلی میرے قہقہوں سے گونجا کرتی تھی۔ یہ دیکھو۔" شاہ فضل نے ہاتھ میں پکڑی تصویر اسے دکھائی۔

اریبہ نے دھندلی نظروں سے دیکھا۔

مسکراتے ہوئے دو چہرے اس کے سامنے تھے۔

"شاہ فضل اور شاہ فیصل۔"

وہ تصویر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر الماری کی سمت بڑھ گیا۔ اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ اندر آج بھی اس کے کپڑے اسی طرح سجے تھے۔ شرٹس، جینز، ٹائیاں، تھری پیس، شلوار کرتے، اجرکیں اور جیکٹیں۔

"یہ سب اس نے میرے ساتھ جاکر خریدے تھے۔"

اس نے تھکے ہوئے انداز میں پٹ بند کردیے۔ اور ان سے پشت ٹکادی۔

"ہر صبح میں انتظار کرتا ہوں کہ میرے سیل پر کال آئے گی اور وہ ہنستے ہوئے کہے گا۔"

"لالہ! آپ بہت یاد آرہے ہیں۔ آپ میرے پاس آجائیں۔"

اور میں اسے ڈانٹ دوں گا اور کہوں گا۔ "تم خود آجاؤ میں بہت مصروف ہوں۔"

لیکن ہر صبح، ہر شام اور ہر رات میرا دل صرف انتظار ہی کرتا رہتا ہے اور میرا فون۔۔۔ اس پر کوئی بیل نہیں بجتی۔ حالانکہ رنگ ٹون اس نے خود سیٹ کی تھی۔ کہتا تھا۔ "تھوڑے سے ماڈرن ہوجائیں۔"

"اب وہ نہیں آئے گا۔ اب تو صرف میں اس کے پاس جاؤں گا۔" اس نے نچلا لب دانتوں سے کچل ڈالا۔

"مگر یہ انتظار۔۔۔ ختم نہیں ہوتا۔ بہت روکا تھا میں نے اسے۔ بہت سمجھایا تھا کہ وہ منصور ملک سے دوستی ختم کردے، مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ تو میری ہر بات مانتا تھا، حکم سمجھ کر۔ جو میں کہتا اس پر کرنا لازم ہوجاتا، مگر پتا نہیں منصور ملک کے معاملے میں اس نے میری بات کیوں نہ مانی؟

کیا دشمنی تھی اسے میرے فیصل سے؟ کیوں اس نے ایسا کیا؟ کیوں اس نے میرے وجود کا ٹکڑا چھین لیا مجھ سے؟ کیوں ادھورا کردیا مجھے؟ کیا بگاڑا تھا میرے فیصل نے اس کا؟"

اس کے لہجے میں ٹوٹی کرچیوں کی سی چبھن تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے کہیں سے ایک بار منصور میرے سامنے آجائے اور میں اس سے پوچھوں کہ مجھے فیصل کی وہ غلطی تو بتادے جس کی پاداش میں اس نے اتنے بے رحمانہ طریقے سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

اس کی آنکھوں کی سرخی بتدریج گہری ہونے لگی تھی۔

اریبہ کو لگا وہ ابھی رو دے گا۔

"آج میرے سیل پہ اس کے کتنے ہی دوستوں کی کالز آئی تھیں۔ وہ سب اس کی سالگرہ منا رہے تھے، اس کے نہ ہونے کے باوجود۔ کوئی میرے دکھ کا تو مداوا کرے۔ وہ مجھے نظر کیوں نہیں آتا۔ میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند اس حویلی میں چکراتا رہتا ہوں۔ یہ حویلی، یہ گاؤں، یہ کھیت کھلیان، ہر جگہ اس امید پر کہ وہ مجھے کہیں تو دکھائی دے گا۔ اس کی ہنسی میں ایک بار پھر سن سکوں گا، مگر میرا انتظار، انتظار ہی رہ جاتا ہے۔"

اس کی گردن جیسے غم کے بوجھ سے بھاری ہو کر سینے پہ گر گئی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔

"ایک بار نفسیات کے پروفیسر نے ہیومن ایڈکشن کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم جب زندگی میں کسی دوسرے شخص کے ساتھ کے عادی ہوجاتے ہیں تو یہ نشہ کی طرح ہماری طلب بن جاتا ہے۔ یہ شخص ہماری زندگی سے نکل جاتا ہے، ہمیں چھوڑ دیتا ہے اور ہم سے بہت دور چلا جاتا ہے تو ہم اذیت و درد کے ناقابل بیان تجربے سے گزرتے ہیں۔

"یہ اذیت مجھے مستقبل کی طرف نہیں بڑھنے دیتی۔ مجھے اندر سے کاٹتی رہتی ہے، بالکل کسی ننگے ہوئے بلیڈ کی طرح۔۔۔ اور یہ اذیت مجھے ایک جنونی کیفیت میں دھکیل دیتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں ہر چیز تہس نہس کردوں۔ میں۔۔۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو تمہارے چہرے میں مجھے منصور کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ قاتل چہرہ جسے یاد کرکے میرا خون کھول اٹھتا ہے اور میں خود پر سے اختیار کھو دیتا ہوں۔ تمہیں اذیت دینے کی خواہش ہوتی ہے پھر میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم اریبہ ہو منصور ملک نہیں ہو۔۔۔

لیکن سکون پھر بھی نہیں ملتا۔ شاید وہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ یہ ذہنی خلجان شاید مجھے پاگل کرکے چھوڑے گا۔" اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

"تم چلی جاؤ یہاں سے۔ کم از کم آج میں تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس سے پہلے کہ میں ایک بار پھر خود پر سے اختیار کھو دوں، "تم جاؤ، جاؤ" وہ بلند آواز میں دھاڑا تھا۔ اریبہ نے ہراساں ہو کر اسے دیکھا اور اضطراری انداز میں واپس مڑی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے مضبوطی سے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر گر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پھیرے تو اسے احساس ہوا کہ اس کے چہرے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"تم ٹھیک کہتے ہو شاہ فضل! تم حقیقتاً" وہ نہیں ہو۔ جو میرے لیے ہو۔ تم صرف انتقام میں اندھے ہو رہے ہو، تمہیں ایک نہ ایک دن اپنی غلطی کا احساس ضرور ہوگا، لیکن اریبہ ملک اس وقت تک شاید زندہ نہ رہے۔۔۔۔

منصور لالہ، یہ آپ نے کیا کردیا ہے۔ آپ کو شاید احساس ہی نہیں کہ آپ نے اس حویلی کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کردیا ہے۔"

پہلی بار اسے منصور ملک سے شکایت ہوئی تھی۔ وہ اس کے خلاف سوچ رہی تھی اور پہلی بار اسے شاہ فضل حق پر نظر آرہا تھا۔

وہ بھی لاشعوری طور پر اسی "ہیومن ایڈکشن" کا شکار ہورہی تھی۔

ہمارے صبر کو نیزے کی صورت
غموں کے دل میں گڑنا آگیا ہے

* * *

دسمبر کی اولین صبح بے حد خنک اور برفیلی تھی۔ حویلی میں جیسے اس سردی کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ تقریباً سب ہی ملازمین اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اریبہ بھی اس ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں کچن میں مصروف تھی۔ شاہ فضل کے لیے ناشتہ بناتے ہوئے اسے سردی کے باعث جھرجھریاں سی آرہی تھیں۔ اس نے بڑا سا چائے کا مگ رکھا اور ٹرے لرزتے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے باہر کی سمت بڑھ گئی۔ مردانے کی سمت بڑھتے ہوئے اس نے اپنے سرد ہاتھوں میں پکڑی ٹرے کو بمشکل تھاما ہوا تھا ورنہ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ٹرے اب لڑھکی کہ تب۔

وہ شاہ فضل کے کمرے سے کچھ ہی دور تھی جب اچانک پتا نہیں کیا ہوا، وہ سامنے سے آتے شاہ محمود کو دیکھ ہی نہیں پائی۔ ایک زوردار ٹکراؤ کے نتیجے میں سب کچھ زمین بوس ہوگیا۔

اریبہ کے حلق سے ایک اذیت بھری چیخ نکلی، گرم چائے نے اس کے پیر جلا ڈالے تھے۔ کچھ چائے شاہ محمود کے کپڑوں کو بھی داغ دار کر گئی، وہ بے اختیار دھاڑ اٹھے۔

"تم۔۔۔ بے وقوف! اندھی ہو کیا؟ دیکھ کر نہیں چل سکتیں؟" ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھ گیا تھا۔

وہ زرد رنگت لیے لرز رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے پیر میں چبھی ہوئی وہ کرچی نکال سکتی جو اسے بے حد تکلیف دے رہی تھی۔

شاہ محمود کی دھاڑ سے پورا مردان خانہ گونج رہا تھا۔

"منحوس! میرا بیٹا کھا لیا تمہارے بھائی نے۔۔۔ اب تم کیا چاہتی ہو۔۔۔ مجھے مت دکھاؤ اپنی شکل۔ جی چاہتا ہے گولی مار دوں تمہیں۔۔۔ ذلیل۔۔۔ دور ہوجاؤ میری

نظروں سے۔۔۔" وہ اپنی بھڑاس نکال رہے تھے۔

اسی وقت شاہ فضل کے کمرے کا دروازہ کھلا' وہ تیزی سے باہر آیا۔ گیلے بال ماتھے پہ بکھرائے' وہ غالباً" نہایت عجلت میں باتھ روم سے باہر نکلا تھا۔

"کیا بات ہے بابا سائیں؟" اس نے معاملے کی نوعیت سمجھ لینے کے باوجود استفسار ضروری سمجھا تھا۔

"اسے چلنے کی تمیز سکھاؤ۔" وہ سرد لہجے میں کہتے دوبارہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ یقیناً" لباس تبدیل کرنے کے خیال سے۔

شاہ فضل نے اریجہ کو دیکھا۔ خطرناک حد تک زرد رنگت لیے لرزتے وجود کے ساتھ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اس نے اریجہ کا بازو پکڑا اور اسے کمرے میں لے گیا۔ وہ کسی۔۔۔ بے جان گڑیا کی طرح کھنچی چلی گئی۔ اسے اندر لا کر صوفہ پہ بٹھایا اور خود دراز کھول کر اس کے پیروں پہ لگانے کے لیے مرہم ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ مطلوبہ مرہم نکال کر اس کے پاس آ گیا۔

اور۔۔۔ اور پھر۔ اس صدی کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہوا تھا۔ وہ اس کے پیروں کے نزدیک جھک کر بیٹھ گیا۔ اس نے انگلی کی پور سے مرہم لگانا شروع کی۔ جیسے ہی اس کے ہاتھ نے اریجہ کا پیر چھوا' اریجہ کے تن مردہ میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ سسکی سی بھری اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بنا کوئی رد عمل ظاہر کیے اپنا کام کرتا رہا۔ مرہم لگانے کے بعد ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"اریجہ! ادھر دیکھو۔" اس نے ہاتھ اریجہ کے شانوں پہ دراز کر کے اسے قریب کر لیا۔

"کیا ہوا تھا؟ بتاؤ مجھے۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔

"مم۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے جان بوجھ کر۔۔۔ نہیں گرایا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ پتا نہیں کیسے ٹرے میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔" وہ روتے ہوئے اسے یقین دلا رہی تھی۔

شاہ فضل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

"پھر؟"

"چائے ان پر گر گئی۔ جس پر انہیں غصہ آ گیا۔ میں۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

شاہ فضل نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر کیا جو آنسوؤں سے تربتر تھا اور پھر۔۔۔ یک لخت چونکا۔ اس کی نظر اریجہ کے گال پر جم گئی۔ عضلات کھنچ گئے اور بھنوؤں کے بیچ ایک شکن آ گئی۔

"انہوں نے ہاتھ اٹھایا تم پر؟" اس کے لہجے سے ہی ظاہر تھا کہ اسے کس قدر ناگوار گزرا تھا۔

اریجہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ شاہ فضل کے لب بھنچ گئے۔ اس نے اریجہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور بیڈ تک لے گیا۔

"لیٹ جاؤ۔ تم ٹھیک نہیں ہو۔" اس نے حکم دیا مگر اتنے نرم لہجے میں؟ اریجہ دنگ سی لیٹ گئی۔ وہ اس پر سرخ شنیل کا لحاف برابر کر کے اٹھا اور سینٹرل ہیٹر آن کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ندرت کو بلا کر گرم دودھ اور ابلے ہوئے انڈے لانے کا کہا۔ فوراً" ہی حکم کی تعمیل کی گئی تھی۔ اس نے انڈے اور کانٹا اس کی طرف بڑھایا' وہ کھانے لگی' پھر دودھ کا گلاس پکڑایا۔ اس نے گھونٹ گھونٹ دودھ پیا اور گلاس واپس ٹرے میں دھر دیا۔ ندرت نے ٹرے اٹھائی اور شاہ فضل کی طرف مڑی۔

"آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اب تم جا سکتی ہو۔" اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے چلتی باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد شاہ فضل نے دروازہ کا بولٹ چڑھایا اور اس کے قریب آ گیا۔ اریجہ کے پیروں پہ لگی مرہم جذب ہو چکی تھی۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں۔" وہ اس کے قریب نیم دراز ہو گیا۔

اریجہ نے بے بسی سے اسے دیکھا اور پلکیں موند لیں۔ ایک ایک کر کے کتنے ہی آنسو بے اختیار گرتے چلے گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" وہ الجھا تھا۔

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے جھوٹ بولا۔

وہ یہ نہ کہہ سکی کہ "شاہ فضل! اتنا نرم رویہ۔۔۔ اتنی توجہ اور اتنی کیئر نہ دو مجھے۔ میں تو تمہارے ظلم و زیادتی کی عادی ہو چکی ہوں۔ اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔"

شاہ فضل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے دل و دماغ کے درمیان ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔

"کیا یہ مظلوم لڑکی اس قابل نہیں شاہ فضل! کہ تم کچھ دیر کے لیے ہی اسے اپنے ہاتھوں کی نرمی بخش دو۔ کیا یہ بے گناہ لڑکی اس قابل نہیں؟ تمہاری وحشتوں کے چراغ اپنے لہو سے جلانے والی یہ لڑکی جسے تم نے جی بھر کے روندا ہے اس قابل نہیں؟" کوئی اس کے اندر بولا تھا۔

وہ ہار گیا۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کی پیشانی پہ دھر دیا۔ اریجہ کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ اس کی نظروں سے ملیں اور جھک گئیں۔ وہ نرم ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا سر دبانے لگا۔

اریجہ کے اندر رم جھم سی ہونے لگی تھی۔ ایک لذت آمیز سکون اس کی رگ رگ میں سرائیت کر گیا۔ وہ کب نیند کی وادی میں اتر گئی' پتا ہی نہ چل سکا۔

* * *

"میں ایک بات سوچ رہی ہوں ندرت!" اس نے رات کے کھانے کے لیے تیز تیز چاول چنتے ہوئے ندرت سے کہا۔

وہ جو بڑے دھیان سے سالن پر کٹا دھنیا چھڑک رہی تھی' چونکی۔

"کیا بات؟"

"کیا۔۔۔؟" وہ رک سی گئی۔ "کیا شاہ سائیں شروع سے ہی اتنے غصے والے ہیں؟" اس کے سوال میں اتنی سادگی اور چہرے پہ ایسی معصومیت تھی کہ ندرت کو پیار آ گیا۔

"نہیں اریجہ بی بی! وہ بس کچھ سنجیدہ مزاج تھے مگر "اتنے" غصے والے واقعی نہیں تھے مگر جب سے فیصل سائیں گئے ہیں نا تو کسی نے انہیں مسکراتے نہیں دیکھا۔ ہنسنا تو جیسے بھول گئے ہیں۔ کبھی کبھی بیگم سائیں بہت روتی ہیں۔ کہتی ہیں میری قسمت میں میرے بچوں کی خوشی تھی ہی نہیں۔ ایک کے لیے تو صبر کر لوں کہ اس کی زندگی ہی اتنی تھی' مگر اس کا کیا کروں جو جیتا جاگتا آنکھوں کے سامنے ہے' مگر اس طرح کہ لاشے کا سا گمان ہوتا ہے۔ نہ خود سکون میں ہے اور نہ وہ معصوم بچی جس کو مفت میں بیٹھے بٹھائے عذاب بھگتنا پڑ گیا۔"

اریجہ چاول چن چکی تھی' جب ہی سنک میں دھونے کے لیے مڑ گئی۔ کچن میں خاموشی تھی۔ ندرت سالن کو دم لگا کر باہر جا چکی تھی۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں ہاتھ چاولوں میں ڈبوئے ہوئے چھپ چھپ کر رہی تھی۔۔۔ بے خیالی میں دوپٹہ سر سے کھسک کر کندھوں پر ڈھلک آیا تھا۔ اس نے چاول دھو کر باؤل شیلف پر دھرا تھا جب اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر مڑی اور حیران رہ گئی۔

اس کے عین سامنے شاہ فضل کھڑا تھا۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے سامنے آ گیا۔ اریجہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یک لخت شاہ فضل نے ہاتھ آگے بڑھائے' وہ جھجک کر پیچھے ہونے لگی تھی کہ اس نے اریجہ کا ڈھلکا آنچل اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال دیا۔

"چادر عورت کی عزت ہوتی ہے اریجہ! اپنی عزت کی حفاظت کرنا سیکھو۔" اس کا لہجہ مدھم تھا۔

وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں بلکہ چلا گیا۔

وہ ایک دم سے جیسے حواسوں میں لوٹ آئی اور پھر۔۔۔ پھر اس نے اس ناقابل بیان خوشی کو محسوس کرنے کی کوشش کی جو اس کے اندر پھیل رہی تھی۔ یہ احساس کتنا جاں فزا تھا کہ شاہ فضل کو اس کا احساس

تھا۔ وہ اسے اپنی عزت مانتا تھا۔ اسے فرق پڑتا تھا۔

اس نے کھڑکی سے لان کے پودوں اور پتوں پر چمکتی دھوپ کو دیکھا اور اسے اپنا دل بھی ان ہی کی طرح چمکتا دمکتا لگا تھا۔

پتا نہیں یہ سب کیا تھا، شاید کسی نئے جذبے کا نقطہ آغاز یا شاید کسی نئی کہانی کا عنوان؟

* * *

وہ آج گھر پر ہی تھا۔ صبح سے ہی وہ اس کے معمولات کا گہری نگاہ سے جائزہ لے رہا تھا۔ صبح کا ناشتہ بنانے کے بعد وہ ملازماؤں کے ساتھ صفائی ستھرائی میں لگ گئی۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کی تیاری شروع کردی۔ اس دوران وہ ایک آدھ بار کمرے میں بھی آئی تھی۔ چپ چاپ دبے پاؤں، وہ لائٹ آف کیے پڑا ہوا تھا، شاید وہ یہی سمجھی کہ وہ سو رہا ہے جب ہی تو یوں گربہ پائی سے چلتی اندر آئی تھی۔

جب وہ دوپہر کا کھانا لے کر اندر آئی تو اس کے ساتھ شاہ محمود کو بیٹھا دیکھ کر جھجک سی گئی۔ اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پہ دھری۔

"ادھر آؤ لڑکی۔" ان کی پر تحکم آواز گونجی۔

وہ سہم سی گئی۔

"کیسی بے حس اور ذلیل لڑکی ہو تم؟ تمہیں احساس ہے کہ میرا بچہ صبح سے اس کمرے میں پڑا ہے۔ تم نے نہ پوچھنا گوارا کیا، نہ بتانا؟" وہ سخت لہجے میں بازپرس کر رہے تھے۔

اس نے ہراساں ہو کر شاہ فضل کی صورت دیکھی۔

"میں سمجھی آپ سو رہے ہیں۔"

"تم اپنی سمجھ اپنے پاس رکھو اور آنکھیں کھول کر رکھا کرو۔" انہوں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ فضل نے ان کی بات اچکی۔

"اربیحہ! تم جاؤ اور میرے لیے چائے لے کر آؤ اور ساتھ میں سر درد کی ٹیبلٹ بھی۔" شاہ فضل کو جیسے اس لمحے اس پہ ترس آ گیا تھا۔

"فضل! اسے اتنا سر پہ مت چڑھاؤ۔ اور تم واپس آؤ اور اس کا سر دباؤ۔ کیا ضرورت ہے فضول دوائیاں لینے کی۔" وہ جیسے بھڑک سے اٹھے تھے۔

"بابا سائیں! رہنے دیجیے، سب ٹھیک ہے۔" اس نے اکتا کر ہاتھ اٹھایا تھا، پھر لحاف سائیڈ پہ کرتا اٹھا، اربیحہ نے فوراً "سلیپر" ڈھونڈ کر اس کے آگے رکھے۔

"میں چینج کرنے جا رہا ہوں تم چائے بنا کر لاؤ۔" وہ کہتا ہوا ڈریسنگ روم کی سمت بڑھ گیا۔

اربیحہ شش و پنج میں کھڑی تھی۔ شاہ محمود تنے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھے اور زور سے اجرک جھاڑ کر بازو پہ پیٹی اور اسے قہر آلود نگاہ سے نواز کر باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد اربیحہ نے ایک طویل پرسکون سانس لیا اور کچن کی طرف نکل گئی۔ جب وہ چائے بنا کر لوٹی تو فضل گیلے بال لیے کف چڑھا رہا تھا۔

اربیحہ نے دیکھا سیاہ شلوار قمیص اس کے دراز قد اور سرخ و سفید رنگت پہ خوب جچ رہا تھا۔ اس کی چوڑی ہتھیلی بڑے لاپروا انداز میں کف کو الٹ رہی تھی بالکل ویسے جیسے لاپروائی سے وہ زندہ وجودوں کو الٹ پلٹ دیا کرتا تھا۔ اس کے دل کو یکدم کچھ ہوا تھا۔ ہتھیلیوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ "ہو گیا میرا جائزہ مکمل؟" وہ اس کی چوری پکڑ چکا تھا جب ہی بڑے سکون سے اسے بے سکون کر گیا۔

شرمندگی کے احساس سے اربیحہ کا چہرہ تپ اٹھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں

پھر وہاں سے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور مڑی۔

"جا کہاں رہی ہو؟" چائے کا کپ اٹھا کر اس نے پوچھا۔

"میں یہ واپس رکھ آؤں۔" اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ وہ بمشکل سن پایا۔

"یہاں بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ اشارہ بیڈ کی طرف تھا۔ وہ عجیب مشکل میں پھنس گئی۔

"تم سے کہہ رہا ہوں میں۔" اس نے قدرے بلند آواز میں جتایا۔

وہ گڑبڑا کر بیٹھ گئی، پھر بے بسی سے سامنے سجی نعمتوں کو دیکھا اور چھوٹی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر ہاتھ سے نوالے لینے لگی۔ شاہ فضل کی نگاہ بڑی گہرائی سے اس کا تجزیہ کر رہی تھی۔

جب تک اس نے چائے ختم کی تب تک وہ بھی چاول ختم کر چکی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور اٹھنے لگی۔ شاہ فضل کو اس پل وہ بہت تھکی تھکی، پژمردہ اور اداس سی لگی تھی۔

"لائٹ آف کردوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ تم یہ سب چیزیں رکھ کر واپس آؤ۔" فضل نے کہا۔

اربیحہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ شاہ فضل کی نگاہ نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا۔

اسے اس پل وہ "اربیحہ ملک" یاد آئی جسے اس نے نکاح کے دو روز بعد دیکھا تھا۔ دودھیا رنگت، موی سانچے میں ڈھلا وجود اور چہرے پر موجود ملائمت بھری معصومیت۔

آج یہ کون سی "اربیحہ شاہ" تھی زرد رنگت، بجھی آنکھیں لیے جن میں اب صرف کرب تھا اس نوخیز کلی کا سارا وجود بہت ہارا ہوا تھا۔ وہ بیک وقت اس سے نفرت بھی کر رہا تھا اور اس پر ترس بھی کھا رہا تھا۔ وہ جیسے خود کو ہی سمجھ نہ پا رہا تھا۔

وہ اس کی مستقل مزاجی اور صبر پہ حیران تھا۔ وہ ابتدائی دنوں میں ضرور آگے سے بولی تھی مگر بعد ازاں اس نے گویا لبوں پر مہر لگالی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اب شاہ فضل کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ تبدیلی صرف خیالات میں آئی رویوں میں نہیں۔ وہ اس کشمکش اور جھنجلاہٹ کو چھپا نہیں سکا تھا۔

اور اسی شام جب اس نے اپنے کپڑے استری نہ ہونے پر اسے بلند آواز میں گالی دی تھی اور اسے تھپڑ مارا تھا تو وہ کیسے پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور اس پل شاہ فضل کو بے حد خوف محسوس ہوا تھا اس کے صبر سے۔ اس کی ان بے تاثر نگاہوں سے۔

رات کے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے ندرت نے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی تھی مگر اربیحہ نے اسے وہیں ٹوک دیا۔

"اللہ آپ کو بڑا اجر دے گا اس صبر کا بی بی!" وہ خوشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"نہیں۔ تم غلط کہہ رہی ہو ندرت! یہ صبر میں اپنی خوشی سے نہیں کر رہی، یہ میری مجبوری ہے اور اس کا کوئی اجر نہیں۔" اس کا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا، مگر بہت ٹھہراؤ آگیا تھا اس میں۔

باہر کھڑے شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ وہ لب کچلتا واپس پلٹ گیا تھا۔

* * *

ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں
دل کے نازک خانوں میں چبھتی رہیں
سورج اندھے کنویں میں
پڑا روتا رہا
پھول خاک میں اٹے رہے
رنگوں کا حسین قافلہ
دن دہاڑے لٹتا رہا
شہر آرزو پہ خون
دھبوں کی صورت بکھرتا رہا۔

وہ بڑی دیر سے کارپٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سر کے نیچے کشن دھرے، بنا کسی کمبل، کسی چادر کے، ایک بازو آنکھوں پہ دھرے، اس کی آنکھوں سے مسلسل سیل رواں بہہ رہا تھا۔

آج صبح سے ہی اس کی طبیعت کچھ اپ سیٹ سی تھی۔ کچن میں کام کرتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی بارہا کوشش کرتی رہی، آخر چکرا کر گر پڑی۔ بی بی جان کو پتا چلا تو انہوں نے گاؤں کے اسپتال سے ڈاکٹر کو بلالیا، انہوں نے ابتدائی چیک اپ کے بعد بی بی جان کو بتایا تھا۔

"شی از پریگننٹ۔" اربیحہ کا رنگ فق ہو گیا۔

"میرا مطلب ہے یہ امید سے ہے اور میرا خیال ہے یہ اس کی فرسٹ پریگننسی ہے۔ خیر آپ اس کا خیال رکھیں بلکہ اس کے شوہر کو بلائیں' یہ کافی کمزور ہے۔ اگر اس کی ڈائٹ پر مکمل توجہ نہ دی گئی تو مر بھی سکتی ہے یہ۔" ڈاکٹر ثمرین نے تفصیل سے انہیں بتایا۔

بی بی جان ہکا بکا سی بیٹھی تھیں۔

اربیجہ گم صم سی پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ثمرین کو اس پر پیار آگیا۔ انہوں نے اس کا گال تھپتھپایا۔

"کم آن لٹل گرل! ناؤ چیئر اپ' شوہر کہاں ہے تمہارا' میں اسی سے بات کروں گی' بی بی جان! یہ مجھے آپ کی ملازمہ لگتی ہے؟" ڈاکٹر ثمرین نے اس کے حلیے سے بالکل ٹھیک ہی قیاس کیا تھا۔

"ان کے میاں ادھر نہیں ہیں جی۔" ندرت نے جلدی سے کہا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ اربیجہ کے پاس آبیٹھیں' مگر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

بی بی جان! ششدر سی اسے جاتا دیکھتی رہیں پھر ندرت کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ ندرت اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

"اربیجہ بی بی! آپ خوش نہیں ہیں؟" ندرت نے پوچھا تو وہ چونک کر مڑی۔

"خوش کیسے ہوتے ہیں' یہ تو بھول چکی ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!" ندرت نے حیران ہو کر کہا۔

وہ ایک دم جیسے ہوش میں آگئی۔ چند لمحے ہراساں نظروں سے اسے دیکھتی رہی' پھر بے ساختہ اس کے شانے سے لگ کر بلند آواز میں رونے لگی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ندرت! میں کیا کروں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ شاہ سائیں تو میرے ٹکڑے کر دیں گے۔" وہ ہذیانی انداز میں بول رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ شاہ سائیں تو خوش ہوں گے۔" ندرت نے حیرانی سے کہا۔

"وہ خوش نہیں ہوں گے۔ اولاد صرف خاندانی عورت سے پیدا کی جاتی ہے اور میں۔۔۔؟ یہ تو تم بھی جانتی ہو نا ندرت! کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو صرف گھروں میں جگہ دی جاتی ہے' ان سے اولاد پیدا نہیں کی جاتی۔" وہ پھنکار رہی تھی۔

"انہوں نے آپ کو بیوی کا درجہ دیا ہے تو اولاد ہوئی ہے نا۔" ندرت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اپنی ضرورت کے تحت۔" وہ تلخی سے بولی۔

ندرت خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

اس وقت سے لے کر اب تک وہ مسلسل اس کمرے میں بند تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آرہے تھے۔ دروازہ کھلا اور کوئی اندر آگیا' اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا سا پھیل گیا۔ دروازہ بند ہوا اور قدموں کی چاپ صوفے کے قریب جا کر رک گئی۔ وہ سر اٹھائے بغیر بھی جانتی تھی کہ وہ شاہ فضل تھا' وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ یہ جانے بغیر کہ مقابل نے اس کی بھنچی ہوئی مٹھیوں کو فوراً" نوٹ کیا تھا۔

"اربیجہ!" اس نے پکارا۔

وہ اسی طرح پڑی رہی۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور چلتا ہوا اس کے قریب آکر گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گیا' پھر اس کے چہرے سے بازو ہٹا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے؟" اس کا لہجہ سخت ہو اٹھا۔ اربیجہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' آنکھیں بھی شدت گریہ سے سرخ تھیں اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں؟" اس نے سختی سے اس کا شانہ جھنجوڑا۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کے علم میں نہ ہو' یوں انجان بننے کا مقصد؟" اس کی آواز بلند نہیں تھی مگر لہجہ ضرور تھا۔ وہ حیران ہوا۔

"مجھے اپنا بچہ چاہیے۔" اس نے ایک ہی جملے میں باور کروا دیا تھا کہ وہ اتنا بے خبر نہیں تھا۔

"مگر مجھے نہیں چاہیے۔" وہ سارے خدشات' سارے خوف بالائے طاق رکھتے ہوئے پھٹ پڑی۔

وہ دنگ رہ گیا' مگر اگلے لمحے اس کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے اربیجہ کے بائیں گال پر پڑا۔

"بکواس بند کرو۔ تم سے تمہاری مرضی کون پوچھ رہا ہے؟" وہ اس کے بال مٹھی میں جکڑے غرایا۔

اتنا عرصہ دل میں دبا لاوا پھٹ پڑا' غم و غصے کی کیفیت سے پاگل سی ہو گئی۔ اس نے بے اختیار شاہ فضل کی قمیص کا کالر دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

"بچے کی بات تو بعد میں آئے گی۔ پہلے میری حیثیت کا تعین تو کر دیں۔ کیا ہوں میں آپ کے نزدیک جس کی ماں کا درجہ اب تک متعین نہیں ہو سکا' اس کی اولاد کی کیا حیثیت ہو گی۔ بیٹا ہو گا تو آپ جیسا جو عورت کو ذلیل حقیر چیز سمجھے گا اور بیٹی ہو گی تو میرے جیسی جو دن بھر مشقت کی چکی میں پسے گی اور رات کے خوف سے اپنے مرنے کی دعائیں مانگے گی۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی اولاد۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ میرے ٹکڑے کر دیں۔ مار ڈالیں مجھے۔ جان لے لیں میری۔۔۔"

وہ بولتے بولتے ہانپ گئی اور بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

* * *

میری گواہی آدھی ہے تو
میرا جرم بھی آدھا ہوگا
میرا حصہ آدھا ہے تو
میری سزا بھی آدھی ہوگی

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ کارپٹ کے بجائے بیڈ پر تھی۔

اس نے کروٹ لی تو دیکھا فضل شاہ' اس کے بالکل ساتھ ہی نیم دراز تھا' اس کے ہاتھوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ وہ اس کی طرف مطلق متوجہ نہ تھا' خاموشی سے سامنے دیوار پر نظریں جمائے دھواں اڑا رہا تھا۔

"تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں اربیجہ!" اس کی مدھم مگر بھاری آواز اربیجہ کو ساکت کر گئی۔

"بابا سائیں کا کہنا ہے کہ مجھے باقاعدہ طور پر ایک بڑا سا ولیمہ دینا چاہیے تاکہ سب جان لیں کہ تم شاہ فضل کی بیوی ہو۔"

اربیجہ حق دق سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم حویلی کا وارث پیدا کرنے جا رہی ہو اور یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"سنو! مجھے بیٹا چاہیے۔" اس کی تحکمانہ سرگوشی گونجی تھی۔

اربیجہ کے دل میں ٹھک سے ایک تیر پیوست ہوا تھا۔

"تو گویا یہ مہربانی اور نوازش بیٹے کے لیے ہے۔"

* * *

اگلی صبح بہت سی تبدیلیاں لے کر آئی تھی۔

اربیجہ نے حیرت سے اپنے سامنے پڑی خوش رنگ غذاؤں اور پھلوں کے ڈھیر کو دیکھا۔

"بی بی جان! مجھے کچھ نہیں کھانا۔ اللہ کے واسطے مجھے مجبور نہ کریں۔" وہ ازحد اذیت سے بولی۔

بی بی جان نے اس کے زردیاں کھنڈے چہرے کو دیکھا۔

"ایسا نہ کرو بیٹی! پہلے میں مجبور تھی۔ تم نے فضل کا غصہ نہیں دیکھا' ہم نے دیکھا ہے۔ وہ تو شاید تمہیں اسی دن قتل کر ڈالتا' جب لے کر آیا تھا (نکاح کے دن) مگر یہ تو اس کے بابا کا کمال تھا کہ انہوں نے اسے لاہور بھیج دیا' سمجھا بجھا کر بلکہ زبردستی کر کے' تاکہ اس کا غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے۔ اب وہ نرم ہوا ہے تو تم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہو؟" وہ اسے پیار سے سمجھانے لگیں۔

اربیجہ کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ وہ پہلی رات یاد آگئی' جب ایک مرد نے جو کہنے کو اس کا شوہر تھا' جی بھر کے اس کے وجود کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا

اور جو کہنے کو اس کی سہاگ رات تھی، آج بھی اس وقت کی یاد اریحہ کو لرزا گئی۔

"بی بی جان! مجھے عادت نہیں رہی۔ کیوں آپ میرے ساتھ زبردستی کر رہی ہیں۔ میں نہیں کھا سکوں گی۔ سب الٹ دوں گی۔ فائدہ۔"

"اپنا نہیں تو اپنے ساتھ جڑی اس دوسری جان کا ہی کچھ خیال کر لو۔" وہ اسے احساس دلانے لگیں۔

اریحہ نے اذیت سے لب کچلے اور بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر انہیں دیکھا۔

"بی بی جان! اگر بیٹی ہوئی تو پھر۔۔۔؟"

بی بی جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"ایسا نہ کہو۔ اچھی بات منہ سے نکالو۔"

"مجھے یہ سب آسائشات اس لیے دی جا رہی ہیں کہ میں اس حویلی کا وارث پیدا کرنے والی ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میری اس حویلی میں کیا حیثیت ہوگی؟ ایک پھٹے پرانے ورق جیسی۔ اسی لیے میں کہہ رہی ہوں مجھے ان عیاشیوں کا عادی نہ بنائیں۔"

انہیں حیرت ہوئی۔ وہ تو اسے نادان سمجھتی تھیں مگر اس نے تو بہت دور کی سوچی تھی۔

"مگر یہ تمہارے لیے ضروری ہے۔" وہ جیسے عاجز سی ہو کر بولی تھیں۔

"ضروری نہیں ہے بی بی جان! بہت سی عورتیں اس حالت میں ہوتی ہیں تو سارے کام بھی کرتی ہیں۔ محنت مزدوری بھی کرتی ہیں۔ انہیں بھی تو دو وقت کا کھانا بمشکل نصیب ہوتا ہے۔ وہ کیوں ضرورت محسوس نہیں کرتیں ان سب چیزوں کی، کیونکہ وہ عادی نہیں ہوتیں۔ میں بھی نہیں ہوں۔" وہ سفاکی سے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔

بی بی جان خفا سی ہو کر اٹھ گئیں اور جا کر شاہ فضل کو بھیج دیا تھا۔ وہ جو مردانے میں بہت ضروری امور پر گفتگو کر رہا تھا، اس بے جا مداخلت پر دندناتا ہوا اندر آیا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟۔۔۔ کیوں نہیں مان رہیں تم بی بی جان کی بات؟" وہ اس کا بازو دبوچتے ہوئے غرایا۔

وہ آنسو جو اریحہ نے بمشکل روکے ہوئے تھے، شدتوں سے بہہ نکلے۔

"میں نہیں کھا سکتی یہ سب، مجھے عادت نہیں رہی۔ مجھے تو ان چیزوں کا ذائقہ بھی بھول گیا ہے۔ شاہ سائیں! آپ بی بی جان سے کہیں کہ وہ مجھے مجبور نہ کریں۔" وہ شدتوں سے رو پڑی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر واپس مڑ گیا۔ جاتے جاتے بی بی جان سے کہہ گیا۔

"آپ اسے مجبور نہ کریں۔ جب اس کا دل چاہے گا، کھائے گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتا واپس مردان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

اریحہ سوچوں میں گم تھی۔ نئی زندگی کی خبر نے اس میں کوئی امنگ بیدار نہیں کی تھی۔ آج اسے منصور لالہ بہت یاد آ رہے تھے۔ "کاش! وہ یہ سب نہ کرتے، انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی پیچھے رہ جانے والوں کے لیے نہ سوچا۔" کمرے میں بی بی جان کی اچانک آمد سے وہ چونک اٹھی۔ اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بی بی جان کے لیے بیڈ پر جگہ بنائی۔ اس نے دیکھا، ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح جبکہ دوسرے ہاتھ میں موبائل تھا۔ وہ بیڈ پر ٹکتے ہوئے بولیں۔

"تم بہت صبر والی ہو میری بچی! بہت حوصلہ ہے تم میں۔۔۔ اپنی ماں سے بات کر لو، وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہے۔"

اریحہ نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے بہت پیار تھا۔ وہ اسی شفقت آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

"تمہاری ماں کا فون آیا تھا۔۔۔ بہت رو رہی تھی۔ وہ ابھی دوبارہ فون کرے گی۔۔۔ تم اس سے بات کر لینا۔"

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل اس کے پاس ہی بیڈ پر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئیں۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ موبائل دیکھنے لگی۔ اچانک موبائل بج اٹھا۔ وہ بجتے ہوئے موبائل کو خالی نظروں سے تکنے لگی۔ اسے موبائل کی گھنٹی کی آواز میں ایک تڑپ محسوس ہوئی۔ اسے لگا، جیسے یہ موبائل کی گھنٹی نہیں، اس کی ماں کی پکار ہے، جو اس کے لیے تڑپ رہی ہے۔ ماں کے بلکتے ہوئے چہرے کا خیال آتے ہی اس نے فوراً موبائل اٹھا لیا۔

"ہیلو!" اس کی آواز بہ مشکل نکلی۔

"اریحہ! میری گڑیا! کیسی ہو؟"

دوسری طرف کی آواز سن کر وہ تڑپ اٹھی۔

"منصور لالہ! آ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟ کہاں ہیں؟ دیکھیں، آپ کی گڑیا کے ساتھ کیا ہو گیا۔" وہ بری طرح بلک اٹھی۔

"اریحہ، میری گڑیا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ میں نے سوچا تھا، کچھ دنوں بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو میں واپس آ کر پتا کروں گا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ میری گڑیا! میں بے گناہ ہوں۔۔۔ میرا یقین کرو۔۔۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ میں اپنے دوست کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔۔۔ لیکن اب مزید نہیں۔۔۔ اب میں تمہاری زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں کچھ دن علاقہ غیر میں رہا، پھر کینیڈا چلا گیا تھا اور اب واپس آ رہا ہوں۔" منصور ملک کی آواز میں آنسوؤں کی نمی، مگر لہجہ بہت ٹھوس تھا۔

منصور کی بات سنتے ہی وہ تڑپ اٹھی۔

"نہیں لالہ نہیں۔۔۔ میرے ساتھ تو جو ہونا تھا۔۔۔ ہو چکا۔۔۔ اب آپ واپس نہ آئیں۔۔۔ فضل شاہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔۔۔ میرے ساتھ جو ہوا میں نے برداشت کر لیا، لیکن آپ کو کچھ ہو، یہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لالہ! میں نے یہ سارے ستم اس لیے برداشت کیے کہ آپ سلامت رہیں۔ اب آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے، جس سے۔۔۔ آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو ایسا سوچیں بھی نہیں۔ مجھ سے وعدہ کریں۔ آپ ایسا نہیں کریں گے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ منصور ملک کا دل کٹ کٹ کر ٹکڑے ہو گیا تھا۔

بہن کی اس محبت نے اسے مزید پشیمانیوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ کاش وہ ہمت سے کام لیتا، پولیس کے سامنے پیش ہوتا تو یوں اس کی بہن قربان نہ ہوتی۔ اس نے یہ کب چاہا تھا۔ جرم بے گناہی کی سزا وہ خود بھی بھگت رہا تھا اور اس کی بہن بھی۔

اریحہ فون بند کر کے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلک اٹھی۔ ایک طرف یہ خوشی تھی کہ بھائی زندہ سلامت تھا تو دوسری طرف یہ دکھ اسے کاٹ رہا تھا کہ وہ اپنے پیارے بھائی کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

* * *

یہ راکھ راکھ رتیں، اپنی رات کی قسمت
تم اپنی نیند بچھاؤ، ہم اپنے خواب چنو!
بکھرتی ڈوبتی نبضوں پہ دھیان کیا دینا
تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو!!

ایک شان دار جشن تھا، ایک شان دار رات تھی، حویلی کا بڑا سا لان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گڑیا کی طرح سجی اسٹیج پر جلوہ افروز تھی۔ تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی۔ اختتام پر ندرت اسے شاہ فضل کے کمرا میں چھوڑ گئی تھی۔

دل متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ شاہ فضل نے اسے بیوی کا درجہ دے دیا تھا لیکن یہ اس کی وہی روایتی جاگیردارانہ سوچ کا نتیجہ تھا۔

وہ کس طرح یہ برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا بچہ کسی ایسی عورت سے جنم لے جسے اس نے اپنے ملازمین سے بھی بدتر درجہ دیا ہوا تھا۔ اس کے لیے تو ضروری تھا کہ اس کی حیثیت مستند ہوتی۔ اس کی بیوی کو سارا گاؤں جان لیتا، جس کے لیے یہ ولیمہ ناگزیر تھا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ سب آسائشات صرف بچہ کی پیدائش تک تھیں، اسی لیے وہ انہیں قبول کرنے، اپنانے اور ان کا عادی ہونے سے ہچکچا رہی تھی اور تب

زور سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اندر آیا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور بولا۔

”اربیجہ! اس بھاری لباس میں کیسے سو پاؤ گی؟ وہ نرم ہاتھ سے اس کا گال تھپک رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ زیورات اتارے‘ میک اپ صاف کیا۔ نائٹی نکالی اور واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ جب وہ لوٹی‘ وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

”عباس! میں نہیں آسکتا‘ اتنی ایمرجنسی میں۔ بات کیا ہے۔“ وہ خاصا جھلایا ہوا تھا۔ اچانک اس کا چہرہ یکدم تن سا گیا۔

”ہاں‘ میرے پاس ہی ہے۔ ہاں دونوں چیزیں۔“ اس کے چہرے پر عجیب سا کرب چھلکا تھا۔

”صبح نکلتا ہوں آنے کے لیے۔ ابھی تو بالکل نہیں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ اس نے کہا۔

پھر فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”یہاں آؤ۔“ اس نے معمول کا حکم دیا تھا۔

اربیجہ خاموشی سے چلتی اس کے بعد برابر آن بیٹھی‘ اس نے ہاتھ بڑھا کر اربیجہ کو تھام لیا۔

”مجھے... آپ سے کچھ... بات کرنا ہے۔“ اربیجہ نے اس کی جنونی پیش قدمی پر بند باندھنا چاہا۔ جواباً ”شاہ فضل نے اسے جن نظروں سے دیکھا‘ اس کا دل چاہا ڈوب کر مر جائے۔ اس نے بے ساختہ آنکھیں میچ لیں۔ دو بے تاب آنسو فوراً“ چھلک اٹھے تھے۔

کبھی دیکھ غور سے دیکھ
میرے آنسوؤں پر بھی نیل ہیں
انہیں کس نے مارا ہے سوچ تو!
کبھی سن سکوت کی سسکیاں!

* * *

اگلے دن وہ لاہور روانہ ہو گیا‘ اربیجہ نے اسے کافی پریشان اور الجھا ہوا دیکھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پڑی تھی۔ وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ ایس پی عباس نے بغور اس کے بارعب اور وجیہہ چہرے کا جائزہ لیا اور قدرے آگے کو جھک آیا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ قتل منصور ملک نے کیا ہے؟“ اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ شاہ فضل نے ناگواری سے عباس کو دیکھا اور قدرے اشتعال سے کہا۔

”ثبوت تمہارے سامنے پڑے ہیں‘ کس بات پر شک ہے تمہیں؟“ اس نے ٹیبل پر پڑے منصور ملک کے ریوالور اور پوسٹ مارٹم سے ملنے والی اس اکلوتی گولی کی طرف اشارہ کیا۔

عباس نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

”یہی تو‘ یہی تو بنیادی غلطی ہے ہماری۔ ہم اندھا دھند مجرم کو ڈھونڈنے میں لگے ہیں مگر اس بات پر غور کرنے کی قطعی زحمت نہیں کی کہ وہ مجرم ہے بھی یا نہیں۔ یہ دیکھیں۔ روسی ساختہ بریٹا ہے جبکہ پوسٹ مارٹم کے بعد ملنے والی گولی اعشاریہ بتیس بور کی ہے۔“ انہوں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”پولیس سے زیادہ اسلحہ کی پہچان کسی اور کو نہیں ہوتی۔ قتل منصور نے نہیں کیا بلکہ اس ریوالور میں تو کوئی گولی تھی ہی نہیں۔ اگر منصور ملک‘ شاہ فضل کو مارنا چاہتا تھا تو پھر وہ یہ خراب پسٹل وہاں کیوں لے کر آیا تھا؟“ ”خراب...؟“ شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”جی خراب یہ دیکھیں یہ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ دیکھیں اس کا ٹرائیگر کام نہیں کرتا۔“ اس نے چلا کر دکھایا اور بات آگے بڑھائی۔

”اگر منصور ملک نے یہ قتل کیا بھی ہے تو وہ یہ خالی ریوالور وہاں کیوں پھینک گیا‘ جس پر اس کے فنگر پرنٹس بھی تھے جبکہ مجرم پہلے اپنے فرار کا راستہ دیکھتا ہے‘ پھر جرم کرتا ہے۔ کیا وہ اتنا احمق تھا کہ اپنا لائسنس یافتہ ریوالور وہاں پھینک کر چلا گیا۔ اور آخری بات! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی تقریباً ”تیس گز کی دوری سے چلائی گئی تھی لیکن اس کچی زمین سے صرف ان پیروں کے نشان ملے جیسے دو شخص آپس میں کھڑے باتیں کر رہے ہوں ہو سکتا ہے بات اس ریوالور کے حوالے سے ہی کر رہے ہوں اور اسی دوران گولی کسی اور طرف سے چلائی ہو۔ منصور خوف زدہ ہو گیا اور بدحواسی میں ریوالور وہیں پھینک کر بھاگ گیا اور یوں ہم مسلسل دو تین ماہ سے ایک غلط شخص کی تلاش میں پاگل ہو رہے ہیں جبکہ اصل مجرم آزاد پھر رہا ہے۔“ عباس اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

شاہ فضل پھیکا چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ اس کی بے یقین نظریں عباس پر جمی تھیں۔

”آپ کی کسی سے کوئی ذاتی رنجش؟ کوئی کسی قسم کی معمولی جھڑپ؟ کچھ بھی؟“ عباس نے سوال کیا۔

شاہ فضل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پھر بھی آپ اس پر غور ضرور کریں شاہ صاحب! ممکن ہے کہ کسی نے اپنی خفیہ دشمنی نکالی ہو۔“

تب ہی اس کا ڈرائیور نثار ایک کانسٹیبل کے ساتھ اندر آ گیا۔

سائیں! آپ سے بات کرنا ہے۔“

”بولو نثار!“ وہ خود کو سنبھال کر بولا۔ لہجے کا طنطنہ قدرے دھیما پڑا ہوا تھا۔

”سائیں! حویلی سے فون آیا ہے بڑے سائیں کا۔“ اس نے بتایا۔

”کوئی خاص بات؟“ وہ چونکا۔

”وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے مگر آپ کا فون شاید بند ہے۔“

”ہاں۔ ٹھیک ہے تم جاؤ‘ میں کر لوں گا۔“ فضل نے اسے جانے کا کہا۔

کمرے میں ایک بار پھر ہولناک اور پراسرار خاموشی چھا گئی۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”شاہ فضل نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی کنپٹی کو مسلا۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھوں کی سرخی دم بہ دم گہری ہوتی جا رہی تھی۔ یہ احساس کتنا اذیت ناک تھا کہ وہ غلطی پر تھا اور اربیجہ بے قصور تھی۔ اسے اربیجہ کا خیال آ گیا۔

”ساری تفصیل میں آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں شاہ صاحب! آپ پلیز محتاط رہیے۔“ عباس نے اس کی پریشانی دیکھ کر مخلصانہ مشورہ دیا۔

شاہ فضل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر نہ سمجھنے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا‘ پھر تھک کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

”کافی منگواؤں آپ کے لیے؟“ عباس نے پوچھا‘ پھر اس کے سر ہلانے پر انٹر کام اٹھا کر کافی کا آرڈر دینے لگا۔

* * *

”اس کو کیا لگتا ہے وہ اتنی جلدی مجھ تک پہنچ جائے گا؟ ہونہہ! یہ اس کی بھول ہے۔ قیامت کے دن شاہ فیصل بھی نہیں بتا سکے گا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔“ وہ حقارت سے کہتے ہوئے ہنسا۔ چند لمحے دوسری طرف فون پر مخاطب عورت کی آواز سنتا رہا‘ پھر بھڑک اٹھا۔

”بس کر دے تو۔ تو اور تیرے ڈراوے۔ بھر بیٹھا میں ان سے۔ اللہ بس مجھے ہی دیکھ رہا ہے کیا؟ ان وڈیروں کو نہیں؟ ان کی رسیاں کیوں دراز ہیں؟“ وہ تنفر سے کہہ رہا تھا۔

”وہ رہنے دے۔ اربیجہ بی بی کی آہ لگ جائے گی۔“ اس نے منہ بگاڑ کر نقل اتاری۔

”مجھے نہیں لگتی کسی کی آہ واہ‘ اور اس پر کون سا ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ کون سے پتھر توڑنے پڑ رہے ہیں اسے؟ فضل بابو کی زال (بیوی) ہے وہ جس کا ولیمہ کھایا ہے پورے گاؤں نے کیا تکلیف ہے اسے وہاں؟“ اس کی تنگ پیشانی شکنوں سے پُر تھی۔

”چل بس کر مجھے نہیں چاہیے تیرا بھاشن۔ شادی کرا لوں ایک بار تجھ سے‘ پھر بتاؤں گا۔“ اس نے فون بند کرتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ چند لمحے

کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر بی ایم ڈبلیو کی طرف بڑھ گیا۔

* * *

کافی کے مگ سے اٹھتی بھاپ فضا میں عجیب عجیب سے ہیولے بناتی اڑ رہی تھی۔ ایس پی عباس نے شاہ فضل کا چہرہ جانچا پھر بالکل سپاٹ پا کر نظر پھیر لی۔

“آپ کو کسی پہ شک ہے؟” عباس نے قدرے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

“یقین سے کہا نہیں جا سکتا۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں مگر وہ بہت نچلے درجے کے لوگ ہیں۔ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ یقیناً کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کا کام ہے، جس نے سچویشن کو اتنی مہارت سے استعمال کیا کہ ہم مسلسل دو ماہ سے بے وقوف بن رہے ہیں۔” اس نے تفصیل سے بتایا۔

عباس نے دیکھا بولتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خالی پن اور آنکھوں میں سکوت طاری تھا۔

“کیا آپ کے ذہن میں ایک بھی نام نہیں؟” عباس الجھا۔

شاہ فضل نے لب بھینچتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

“پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنی سیکورٹی بڑھا لیجیے۔ یہ خفیہ دشمن آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس صورت میں تو خطرہ مزید بڑھ جائے گا جبکہ ہم اس کا مقصد نہیں جانتے، نہ ہمیں اس کی ڈیمانڈ کا اندازہ ہے، نہ اس کے ٹارگٹ کا۔”

وہ سر ہلا کے اٹھ گیا۔

“ایک آخری بات شاہ صاحب! اپنے اردگرد خصوصی نظر رکھیے، تاریخ گواہ ہے، پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے اکثر اپنے ہی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے ساتھ بھی کوئی ایسی کالی بھیڑ ہو جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہو۔”

عباس کے لہجے سے حقیقی فکر مندی جھلک رہی تھی۔

“مجھے اعتراف ہے عباس! اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جولیس سیزر کو قتل کرنے کے لیے اٹھنے والا سب سے پہلا ہاتھ اس کے سب سے عزیز ترین دوست بروٹس کا ہی تھا۔” وہ ہلکے سے مسکرایا اگرچہ اس کی مسکراہٹ بہت پھیکی تھی۔ اور باہر نکل گیا۔

نثار نے اسے دیکھ کر ادب سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھتے ہی گاڑی تیزی چل پڑی۔

“کہاں چلوں سائیں؟” اس نے گردن موڑ کر پوچھا۔

“ماڈل ٹاؤن چلو۔” اس نے لاہور میں موجود اپنے گھر کا کہا۔

“حویلی نہیں جائیں گے؟”

“اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

“کچھ پتا چلا سائیں؟” اس کے لہجے میں تجسس اور کھوج تھا۔

“نہیں۔” اس نے ایک لفظی جواب دیا۔

“آپ فکر مت کریں سائیں! رب تعالیٰ نے چاہا تو مجرم ایک دن شرمناک انجام سے دوچار ہو گا۔ فیصل سائیں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔” اس نے خلوص سے کہا۔

اس پل وہ نہیں جانتا تھا کہ بعض دعائیں کتنی جلدی مستجاب ہوتی ہیں۔

* * *

“تم فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں مت لو فضل! تم عدل کا ترازو رب کے پاس رہنے دو۔ تم جزا و سزا کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔”

اسے یاد تھا یہ الفاظ اسے بی بی جان نے تب کہے تھے، جس دن وہ اریجہ کو نکاح کر کے لایا تھا۔

اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی۔

“کیا کر لیا ہے میں نے اپنے ساتھ؟؟؟ کیا ہو گیا ہے مجھ سے؟”

اس نے بے بسی سے اپنے بال نوچ ڈالے۔

اس کے اندر کوئی بہت زور سے اس پر ہنسا۔

“تم تو اپنے آپ کو فرعون سمجھ بیٹھے تھے شاہ فضل! تمہیں ہمیشہ سے یہی لگتا ہے کہ تم درست ہو، تمہارے سارے فیصلے درست ہیں اور باقی ساری دنیا غلط۔ کیا جواز تھا تمہارے پاس اریجہ سے کیے جانے والے اس غیر انسانی سلوک کا؟ صرف یہ کہ وہ تمہارے بھائی کے قاتل کی بہن تھی۔ یہی اس کا جرم تھا، یہی اس کی خطا اور یہی اس کا گناہ؟ تمہیں ایک پل خیال نہیں آیا کہ وہ معصوم لڑکی بے گناہ ہے۔ ذرا سوچو! تم نے تو کبھی اس کو لڑکی سمجھ کر بھی اس سے نرمی اختیار نہ کی، اسے بیوی سمجھ کر پیار نہ کیا بلکہ تم نے تو اسے انسان سمجھ کر بھی اس پر ترس نہ کھایا۔” ضمیر کی عدالت بے رحمی سے اس کا محاسبہ کر رہی تھی۔

اس نے پاگل ہوتے ہوئے کرسٹل کا گلدان آئینے پہ دے مارا۔ اس کا عکس کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا بالکل ویسے جیسے اس کی شخصیت، اس کی انا، اس کا وقار، اس کا غرور اور اس کی رعونت کے ریزے ریزے ہو گئے تھے۔

* * *

عجب صورت حال ہوتی جا رہی ہے
رات کے بعد رات ہوتی جا رہی ہے
وہ تو آج بھی مکمل ہے پتھر کی طرح!
ریزہ ریزہ تو میری ذات ہوتی جا رہی ہے
میں تو آج بھی تنہا ہوں کل کی طرح محسن
ساری کائنات تو اس کے ساتھ ہوتی جا رہی ہے۔

رات سے اسے شدید فلو ہو رہا تھا، وہ بستر میں گھسی ہوئی تھی۔ دل کو عجیب ہی بے کلی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اب جیسے ہڈیاں بھی دکھ رہی تھیں مگر نیند تھی کہ ہنوز آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی۔

“بی بی جان! شاہ سائیں کب آئیں گے؟” پتا نہیں کیوں آج وہ بی بی جان سے پوچھ بیٹھی۔ وہ ہنس پڑیں۔

“مردوں کو سو کام ہوتے ہیں بیٹی! آجائے گا ایک دو دن میں۔” انہوں نے ہلکا سا جتایا۔

وہ خفیف سی ہو کر اٹھ گئی۔

* * *

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ بیڈ پر آڑھا ترچھا دراز وجود گہری نیند میں تھا، یوں کہ اس کی دائیں ٹانگ بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھی اور بایاں بازو سینے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کی اس قدر گہری نیند نما بے ہوشی کا سبب غالباً ”نہیں یقیناً“ وہاں بکھری تین چار خالی بوتلیں تھیں جن میں موجود “مشروب” ”لازماً“ پیٹ میں انڈیلا جا چکا تھا۔ بیڈ شیٹ پر جا بجا سلوٹیں تھیں۔ بے شمار سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے تھے اور کافی کا خالی مگ بھی لڑھکا ہوا تھا۔ قریب ہی سلور گرے چمکتا ہوا سیل فون پڑا ہوا تھا جو کہ ہر دو منٹ کے وقفے کے بعد زور و شور سے بجنا شروع ہوتا مگر اس کی مدہوشی میں کوئی خلل نہیں پڑا، وہ اسی طرح پڑا رہا۔

فون ایک بار پھر بج رہا تھا اور اس کے ساتھ اس بار زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ چند لمحے وہ مندی آنکھوں سے دیوار کو دیکھتا رہا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دھیان دروازے کی طرف گیا مگر پاس ہی بجتے فون نے اس کی توجہ کا مرکز بدل دیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دستک کی آواز اب رک چکی تھی۔

“ہیلو!” اس کی آواز تھکی ہوئی تھی۔

“فضل! کیا بات ہے کدھر ہو تم؟ کل سے تمہارا نمبر ملا رہا ہوں۔ نثار کو بھی پیغام دیا تھا کہ تم سے کہے مجھے فون کرو مگر تم۔ آخر تم ہو کہاں؟ ایک فون بھی نہیں کر سکے تم کہاں ہو؟ میں اتنا پریشان ہوں۔”

شاہ محمود رکے بغیر اسے لتاڑ رہے تھے۔

شاہ فضل کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ ساتھ ہی ساری اذیت و درد، احساس جرم اور خوف نے یکلخت اس پر بھرپور شدت سے حملہ کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی بل میں چھپ جائے۔

“خیریت بابا سائیں؟” اس کا لہجہ دھیما تھا۔

شاہ محمود بری طرح چونکے تھے۔

"ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ کل تک اپنے کام نمٹا کر آجاؤ' کل بیٹھک ہے۔ کچھ اہم فیصلے لینے ہیں۔ اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"اگر نہ آسکوں تو؟" اس نے کہتے ہوئے لب بھینچے تھے' ایک انی سی سینے میں گڑی تھی۔

"نہیں۔ تمہیں آنا پڑے گا۔ میں نے کہا نا! تمہارا ہونا ناگزیر ہے۔" ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

شاہ فضل نے قدرے توقف کے بعد ہامی بھرلی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کردیا۔ مگر ایک بار پھر اسے آنے کی تلقین کی' وہ فون ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھا تھا۔

"اربیجہ کا سامنا کیسے کرے گا وہ؟"

درد کی ایک لہر اس کی بائیں کنپٹی سے چلتی ہوئی سارے سر میں پھیل گئی۔ اس کے غرور اور انا پر پڑنے والی یہ چوٹ بڑی کاری تھی اور چونکہ پہلی بھی تھی' اس لیے اذیت کی ہر حد پار کر رہی تھی۔

وہ اٹھا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ دیر تک نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ اس نے باہر آکر بال بنائے اور کمرے کی ابتر حالت کو نظر انداز کرتا باہر کی سمت بڑھ گیا۔ نثار اسے لاؤنج میں ہی پریشانی سے ادھر ادھر ٹہلتا ہوا مل گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کی سمت لپکا۔

"شاہ سائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا! کل سے یوں کمرہ بند کیوں ہیں؟ حویلی سے بڑے شاہ سائیں کے کتنے ہی فون آچکے ہیں۔ میں بھی صبح سے دروازہ بجارہا ہوں۔ آپ... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" وہ پریشانی سے بولتا گیا۔

شاہ فضل نے سرد نظروں سے اسے دیکھا' اگلے ہی لمحے نثار کا منہ بند ہوگیا۔

"گاڑی نکالو۔ ہم فیکٹری چل رہے ہیں۔"

"جو حکم سائیں!" وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

فیکٹری میں چند ضروری کام نمٹا کر وہ حویلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

جس وقت اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی' رات چاروں طرف اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ تاریکی میں پام اور سفیدے کے درخت ساکت کھڑے تھے اور ان کی شاخیں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہی دھند اس کے دل پر بھی چھا رہی تھی۔ وہ دل پر ڈھیروں بوجھ سنبھالے مردان خانے کی سمت بڑھ گیا۔

اس کی آمد کی خبر سب سے پہلے ندرت کو ہوئی جس نے سرونٹ کوارٹرز کی طرف جاتے ہوئے نثار کو دیکھا تھا۔ وہ الٹے قدموں پلٹی اور اس کے کمرے تک پہنچی۔ آہستگی سے دروازہ بجایا۔

"آؤ' ندرت" وہ دستک پہچان چکا تھا۔

"سلام شاہ سائیں!" اس نے ادب سے کہا۔

شاہ فضل نے چادر کندھوں سے اتار کر ایک طرف پھینکی اور اس کی طرف مڑا۔

"اربیجہ کہاں ہے؟" ندرت کو اس کی آواز میں عجیب سی بات محسوس ہوئی مگر وہ اسے کوئی نام نہ دے سکی۔

"وہ بیگم سائیں کے کمرے میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" اس نے جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ کھائیں گے آپ؟ چائے' کافی؟"

"نہیں۔"

وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

وہ صوفہ پر بیٹھ گیا۔ سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھایا اور آہستہ آہستہ مشروب اس کے اندر انڈیلا۔ اس کو آخری حد تک لبریز کرکے اس نے بوتل سائیڈ پر رکھی اور ایک لمبا سا گھونٹ لیا' پھر تیز تیز گھونٹ بھرنے لگا۔

اس وقت وہ دوسرا گلاس ختم کر رہا تھا۔ جب دروازہ کھلا اور اربیجہ اندر آئی۔

"سلام شاہ سائیں!"

شاہ فضل نے سرخ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور تب اربیجہ کو ادراک ہوا کہ وہ کس شغل میں مصروف ہے۔ اسے جھٹکا لگا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی۔

"آپ یہ... یہ کب سے پینے لگے؟ میں نے آپ کو کبھی پہلے نہیں دیکھا۔" اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ' اس کی لرزتی آواز اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں جیسے سارے راز عیاں کرنے پہ تلی بیٹھی تھیں۔

"تو... ؟ ثابت ہوگیا کہ مجھ میں ہر برائی موجود ہے پھر؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اربیجہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔ وہ ایک بار پھر گلاس بھر رہا تھا۔

"اربیجہ! بیٹھ جاؤ۔" اس کا لہجہ بڑا عجیب تھا۔ دھیما سلگتا ہوا۔

اربیجہ خاموشی سے اس کے پیروں کے نزدیک ٹک گئی۔ شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔

"اگر میں اس فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں دوں کہ تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہو تو جا سکتی ہو... تو تمہارا فیصلہ کیا ہوگا؟" اس کا لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔

"یہ کیسا سوال ہے؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

وہ پھٹ سی پڑی۔ "آپ... آپ ہمیشہ مجھ سے اتنے مشکل سوال کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو مزا آتا ہے نا مجھے مشکل میں ڈال کر۔" وہ سسک اٹھی۔

شاہ فضل نے خالی گلاس ٹیبل پر پٹخا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔ دونوں ہاتھ سختی سے اس کے شانوں پہ جما دیے۔

"میری بات کا جواب دو اربیجہ! میں پاگل ہو رہا ہوں۔" اس نے وحشت سے اس کے شانے جھنجھوڑ ڈالے۔

وہ زور زور سے رونے لگی۔

"میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔" وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"کیوں نہیں ہے تمہارے پاس جواب۔ کیا تم آزادی نہیں چاہتیں؟"

"کیا یہ بھی آپ کے انتقام کا حصہ ہے۔" آنسو پونچھ کر اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"بے وقوف لڑکی! میں تو تمہیں رہائی دے رہا ہوں۔" وہ تلخی سے ہنسا۔

"رہائی؟ آپ مجھے ہمیشہ کے لیے رہائی دے دیں' مجھے جان سے مار ڈالیں۔"

"اربیجہ! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ تمہیں کیسے بتاؤں؟" وہ زچ ہوگیا۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کو مجھے اذیت دے کر خوشی ملتی ہے۔ آپ کے انتقام کے جذبہ کی تسکین ہوتی ہے آپ میری مرضی کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مجھے فیصلہ سنائیں۔ جو آپ چاہتے ہیں۔"

وہ زچ ہوگیا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے۔

اس نے دل کڑا کرکے اس کو سب بتانا شروع کردیا۔ شروع سے لے کر آخر تک بنا رُکے' بنا چھپائے اس نے اربیجہ کو حرف بہ حرف بتا دیا۔

وہ زرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی گئی' اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دیواروں اور چھتوں کا سارا بوجھ اس پر گر رہا ہو۔ وہ بلند آواز میں رونا چاہتی تھی۔ وہ سانس لینا چاہتی تھی' مگر اس کا وجود ملبے تلے دبتا جا رہا تھا۔

اس نے زور سے سانس لینے کی کوشش کی' مگر ناکام رہی' اس کی آنکھوں کے گرد دھندلا غبار چھانے لگا۔ شاہ فضل کے ہلتے ہونٹ بس اسے دکھائی دے رہے تھے وہ یہ ادراک کرنے میں ناکام تھی کہ وہ اب کیا کہہ رہا تھا۔

اس کا سر زور سے چکرایا' اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی' مگر بے سود۔ اگلے ہی لمحے وہ شاہ فضل کے بازوؤں میں آرہی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔

* * *

اریبہ اس وقت "حمید لطیف ہسپتال لاہور۔" کے گائنی وارڈ میں تھی' بی بی جان بینچ پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

وہی مخصوص ماحول' دوائیوں کی بو سے رچا بسا' پریشان چہرے لیے مریضوں کے لواحقین' تیز تیز چلتے ڈاکٹرز اور آگے پیچھے بھاگتے وارڈ بوائز اور نرسز۔

شاہ فضل کے چہرے پر جیسے چٹانی سکوت چھایا ہوا تھا۔

ڈاکٹر فیاض باہر آئے تو شاہ فضل بے چینی سے ان کی سمت بڑھا۔

"آئی ایم سوری شاہ صاحب! ہم آپ کے بے بی کو نہ بچا سکے۔"

شاہ فضل کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ ساکت سا انہیں دیکھتا رہا۔

"آپ کی مسز کو اچانک کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ کنڈیشن ہوئی' ہم نے پوری کوشش کی' مگر جو خدا کی مرضی۔" وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔

"آج ایک اور جرم تمہارے کھاتے میں درج ہو گیا شاہ فضل۔" کوئی اس کے اندر چلایا تھا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں بینچ پر گر سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ریت سی چبھ رہی تھی۔

"کیا ہوتا اگر میں ابھی اسے نہ بتاتا مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکا' یہ بوجھ نہیں ڈھو سکا' سوچا اسے اتار کر پھینک دوں' جتنی جلدی ہو سکے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اسے سہار پائے گی یا نہیں۔ کیا مجھ سے بڑھ کر کوئی خود غرض ہو سکتا ہے؟"

اسے اپنے آپ سے شرم آئی۔ بی بی جان اب نرس سے پوچھ رہی تھیں' جو ان کو ان کی زبان میں بتا کر آگے چل دی۔ اس نے بی بی جان کی سسکیاں سنیں اس کا دل چاہا خود کو شوٹ کر لے۔

وہ جھٹکے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ وہ کسی کا سامنا کرنے کی کنڈیشن میں نہیں تھا' اریبہ کا تو بالکل بھی نہیں۔

* * *

وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی تھی کمرے میں گہری تاریکی تھی' اتنی گہری کہ اسے کسی قبر کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ اس کے نزدیک تھا' اپنی تمام تر درندگی اور سفاکی کے ساتھ

"میں بے قصور ہوں۔ شاہ سائیں!" وہ بند آنکھوں سے سسکی تھی۔

یک لخت اس کی گردن ایک مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں کسی گئی' وہ بے پناہ اذیت سے تڑپی تھی اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تھی' مگر ناکام رہی تھی۔

وہ بلند آواز سے چیخنے لگی۔

"میں بے قصور ہوں شاہ سائیں! مجھے مت ماریں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ مجھ پہ رحم کریں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔"

اس کے اعضاء میں ایک تشنجی اکڑاؤ آنے لگا۔ اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی' اس کے وجود کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ یک بیک دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھولا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساکت اور احساس سے عاری نگاہ یک ٹک چھت کو گھور رہی تھی۔ پتا نہیں کون اس پہ جھکا تھا' اگلے ہی لمحے اس نے اپنے دائیں ہاتھ پہ سوئی کی چبھن محسوس کی اور اس کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سے غنودگی میں جا چکی تھی۔

بی بی جان گم صم سی اس کی حالت دیکھ رہی تھیں۔ پتا نہیں' اریبہ نے کون سا ڈراونا خواب دیکھا تھا جو وہ یوں مدہوشی کے عالم میں اس قدر تکلیف اور شدت سے چلا رہی تھی۔ مستزاد اس کے الفاظ وہ گنگ سی تھیں۔

"فضل! کیا کر بیٹھے ہو اس بچی کے ساتھ؟" وہ ہولتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

عجیب بیزار کن دنوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ حویلی واپس آ گئی تھی' مگر اب تک اس کا شاہ فضل سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ دوسری طرف وہ جا کر لاہور بیٹھ گیا تھا۔ آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ بی بی جان اس کے معمولات کا جائزہ لیتی رہتی تھیں اور اندر ہی اندر پریشان ہوتی رہتیں۔ کتنی ہی بار وہ شاہ محمود سے بات کر چکی تھیں کہ وہ فضل سے بات تو کریں کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی کا کھیل کب تک چلتا رہے گا۔

جنوری کا وسط چل رہا تھا۔ موسم بے حد سرد تھا۔ سورج ایسا ضدی تو نہیں تھا کہ چہرہ دکھانے کا روادار ہی نہ تھا اور دھند تھی کہ ایک ماں کی طرح سارا سارا دن فضا کو آغوش میں لیے رکھتی۔

وہ تیرہ جنوری کا دن تھا' سردی تمام دنوں سے بڑھ کر تھی۔

بی ایم ڈبلیو تیزی سے کچے رستے پہ دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ قبرستان کے گیٹ کے قریب رک گئی۔ دروازہ کھلا' باہر آنے والی ہستی شاہ فضل کی تھی۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا مختلف قبروں کے قریب سے گزرتا شاہ فیصل کی قبر کے قریب جا کر رک گیا۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا' پھر تھکے ہوئے انداز میں نیچے بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو فیصل؟" اس نے ہاتھ قبر پر یوں رکھا گویا وہ فیصل کا شانہ ہو' آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

"مجھے پتا ہے' ٹھیک ہو گے۔ مجھے دیکھو! میرے ہاتھوں سے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ دیکھو فیصل! تمہاری محبت میں' میں نے کتنے لوگ برباد کر ڈالے' کتنے دل اجاڑ ڈالے' وہ لڑکی.... وہ میرے دل کا ناسور بن گئی ہے۔ میں کیا کر چکا ہوں اس کے ساتھ۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی' مگر میں اس سے معافی مانگوں گا بھی کیسے؟ مجھ میں تو اتنا حوصلہ ہی نہیں۔ تمہیں پتا ہے' نا میری ضدی اور انا پسند طبیعت کا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں ہوتا کہ میں.... میں فیصلے کی غلطی کر سکتا ہوں؟؟؟

مگر میں کر چکا ہوں۔ مجھے تسلیم ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی ہے۔ آج بہت حوصلہ اور ہمت کے ساتھ جا رہا ہوں اس کا فیصلہ سننے۔ میری ہمت بندھاؤ یار!" وہ کہتے ہوئے قبر سے لپٹ گیا۔

فضا میں ایک سرد سی خاموشی تھی' یکلخت کوئی الو بہت کریہہ آواز میں چلایا تھا۔ کچھ دور موجود بیری کے درخت میں ہلچل سی مچ گئی ایک دم سے ایک مردہ چڑیا زمین پہ گری اور فضا چڑیوں کے شور سے بھر گئی۔ وہ ساکت سا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور آنکھوں میں گہری دھند اترتی جا رہی تھی۔

"پتا ہے فیصل! بابا سائیں "کار مختار" کی پگ میرے سر پہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہونہہ۔ دیکھو نا کتنا بڑا مذاق ہے میرے ساتھ۔ میں تو رب کے اس فرمان کی پیروی نہیں کر سکا کہ....

"عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔"

تو لوگوں کو کیا دوں گا؟ میرے ہاتھ میں عدل نہیں ہے۔ میں تو اپنے ساتھ انصاف نہیں کر سکا تو کسی دوسرے کے ساتھ....؟" اس نے لب دانتوں تلے دبا کر جیسے اپنا دکھ بہنے سے روکا۔

"میں نے بابا سائیں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لیں گے تب ہی میں حویلی واپس آؤں گا۔ یہ ماں باپ کتنے مجبور ہوتے ہیں نا! آج ہی ان کا فون آیا تھا۔ کہنے لگے۔ آجاؤ! مجھے مت ستاؤ۔ تمہاری ساری باتیں مان لوں گا۔" وہ چند لمحے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

"چلتا ہوں۔" وہ اٹھ گیا۔

وہ شکستہ قدموں سے اپنی گاڑی کی سمت بڑھنے لگا۔ بالکل کسی ایسے شخص کی مانند جو اپنا سب کچھ لٹا چکا ہو۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی حویلی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

جب وہ حویلی پہنچا تو بابا سائیں کسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ بی بی جان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں' کتنی ہی دیر اس کا سر منہ چومتی رہیں۔ وہ خود پر ضبط کرتا رہا' ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ یہ فراخ آغوش میں جو سب خطائیں بھلا دیا کرتی ہے' اس میں چھپ کر سارے اعتراف کر لے۔

"بی بی جان! اریبہ کہاں ہے؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھیں۔

"اپنے کمرے میں ہوگی اور کہاں۔ مجھے تو اس لڑکی کی سمجھ نہیں آتی فضل! مانتی ہوں کہ اس کے ساتھ غلط ہوا، مگر لوگوں کے ساتھ اس سے بھی بڑے حادثے ہوجاتے ہیں۔ یوں سب چھوڑ چھاڑ کر تو کوئی نہیں بیٹھتا۔ میں تو ہار بیٹھی سمجھا سمجھا کر۔ دل چاہتا ہے تو کھانا کھالیتی ہے، ورنہ سارا دن پڑی رہتی ہے۔ منہ سے کچھ نہ بولنے کی تو گویا قسم کھائے بیٹھی ہے۔"

وہ بولتی جارہی تھیں۔ وہ ان سنی کر گیا۔

"میں بہت تھک گیا ہوں بی بی جان! اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ کھانا کھانے کا موڈ نہیں میرا۔ کسی کو مت بھیجیے گا۔" وہ چادر سنبھالتا اٹھ گیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

اریجہ اس کو کھڑکی میں کھڑی نظر آئی۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور وہیں جامد ہوگئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھنے لگا، نظروں کا تصادم ہوا، اریجہ نے پلکیں جھکالیں۔

وہ آہستگی سے چلتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"مجھے تمہارا فیصلہ چاہیے اریجہ!" اس کا لہجہ بڑا پُرسکون اور ٹھنڈا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟" اس کی آواز میں تندی اور چہرے پر سرکشی تھی۔

شاہ فضل نے جیسے اس لمحے بے پناہ ضبط کیا تھا خود پر۔

"تم جانتی ہو۔"

"نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ آپ بتائیں۔" وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔

"یہاں سے چلی جاؤ اریجہ!" اس کا لہجہ بڑا دھیما اور ایک التجا سمیٹے ہوئے تھا۔

اریجہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں شاہ فضل! خون بہا میں آنے والی عورتوں کو طلاق نہیں دی جاتی۔" وہ طنزیہ انداز میں یاددہانی کروا رہی تھی۔

"میں اس روایت کو بدل دوں گا۔" اس نے یقین دلایا۔

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ شاہ فضل نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ہموار چمکدار دانت بڑے خوبصورت تھے مگر ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

وہ خاموشی سے اس پر نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا۔

"میں نے آپ سے زیادہ خودغرض انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ کو اب لگنے لگا ہے کہ میں بے قصور ہوں؟ اوں ہوں۔ بے قصور تو میں دونوں صورتوں میں ہوں۔ جرم منصور لالہ کا تھا یا نہیں، اس بحث سے بالاتر۔ چلیں مان لیتی ہوں کہ آپ کو غصہ تھا، شدید دکھ تھا اپنے بھائی کا اور اسی غم و غصے کو غلط کرنے کے لیے آپ نے ہمیشہ مجھے نشانہ بنایا، نہ صرف نفسیاتی تسکین بلکہ جنسی اور جسمانی تسکین کا بھی، آپ کی خودغرضی کا پہلا ثبوت۔ دوسرا اب جب آپ نے اپنی اولاد کے لیے اپنے وارث کے لیے مجھے اپنے برابر جگہ دی۔ اور اب جب وہ نہیں رہا تو یہ سزا ہے میرے لیے؟ یہ ـــــ یہ کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟"

وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

"بس کرو اریجہ۔" اس کی برداشت جیسے ختم ہونے کو تھی۔

"آپ کیوں نہیں بس کر دیتے؟ ترس نہیں آتا آپ کو مجھ پر؟" وہ پھٹ پڑی۔ زور زور سے روتے ہوئے اس نے شاہ فضل کا گریبان تھام لیا۔

"ایک گولی اتار دیں میرے سینے میں تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ مار ڈالیں مجھے۔" وہ بلک رہی تھی۔

وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اریجہ کے شانوں پہ جمادیے۔

"سزا تو تم مجھے سناؤ۔ جانتی ہو کیا کہا ہے ڈاکٹرز نے؟ یہ کہ تمہاری یہ کنڈیشن، یہ ابارشن کسی شدید ذہنی جھٹکے اور ٹینشن کا نتیجہ ہے تو قصوروار میں ہوا نا! اگر میں خود پر ضبط کرلیتا، تو شاید ایسا نہ ہوتا مگر میں نے ایسا نہیں

کیا۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اریجہ! چلی جاؤ مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ یہاں سے۔" اس نے ہاتھ ہٹالیے اور دم سادھ لیا۔

فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔

اریجہ زرد رنگت اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری عمر ہی ابھی کیا ہے؟ زندگی میں تمہیں سب مل جائے گا، خوشیاں، سکون اور کوئی بہت اچھا شخص۔ مجھ سے تمہیں کیا ملا؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ جاؤ اریجہ۔ جاؤ۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

اریجہ کے ہاتھ جو ابھی تک اس کے گریبان پر تھے، بہت آہستگی سے پہلوؤں میں گر گئے۔

"چلی جاؤں یہاں سے؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی تھی۔

"کہاں چلی جاؤں؟ یہ تو میں بھی جانتی ہوں آپ بھی جانتے ہیں کہ حویلی کی بیٹیوں کی قسمتیں کبھی نہیں بدلتیں۔"

"لیکن اریجہ! میں یہ۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"نہیں شاہ سائیں! اب اور کچھ نہیں۔ آپ اپنا ریکارڈ صاف رکھنے کے لیے اپنے آپ کو اس احساس جرم سے چھٹکارا دلانے کے لیے چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلی جاؤں، مگر ایک بار پھر آپ خودغرضی دکھا رہے ہیں۔ کیا ضمانت ہے آپ کے پاس میری خوشیوں کی؟ میرے سکون کی؟ جو چیز آپ مجھے نہیں دے سکے، آپ کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ کوئی اور شخص مجھے دے پائے گا؟ کیسے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ اور آپ یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ کوئی اور "اچھا سا شخص" میری زندگی کی ساری کمیوں کو پورا کردے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں آپ کی بے وقوفی پر ہنسوں یا روؤں؟ میں آپ کو بتاتی ہوں شاہ سائیں کہ کیا ہوگا؟ جب اریجہ یہاں سے ماتھے پہ ٹھکرائی ہوئی عورت کا داغ لے کر جائے گی تو اس کے اپنے ماں باپ اسے بوجھ تصور کریں گے۔ وہ مجبوراً چند ماہ برداشت کریں گے، پھر اسے کسی اور کے سر لادنے کی سوچیں گے اور وہ "کوئی اور" جو کوئی بھی ہوگا، دو تین بچوں کا باپ، دوسری شادی کا شوقین کوئی بوڑھا، دوسری تیسری بیوی کا امیدوار، کوئی اولاد کا خواہش مند، وہ ان میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے، مگر وہ ہرگز نہیں ہوگا جو آپ سوچ رہے ہیں۔ اور تب کیا حیثیت ہوگی اریجہ کی؟ وہی جو یہاں ہے۔"

شاہ فضل کو لگ رہا تھا کہ اس کے وجود کے سینکڑوں ٹکڑے کردیے گئے ہوں، ہر ٹکڑا ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا تھا۔ وہ خود کو اس اذیت سے نجات دلانا چاہتا تھا، وہ چیخنا چاہتا تھا، وہ رونا چاہتا تھا بلند آواز میں، مگر وہ کچھ نہ کرسکا، وہ بے بسی کے احساس سے چُور اس کے سامنے گر پڑا۔

"دیکھو اریجہ! میں کتنا کنگال ہوں۔ میرے پاس کوئی اچھا عمل، کوئی نرم بات اور کوئی خوبصورت رات نہیں ہے۔ جس کی بنیاد بنا کر میں تمہیں کہہ سکوں کہ تم یہ لے لو اور اس کے بدلے مجھے معاف کردو۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔" وہ لمبا چوڑا مرد، وہ حاکم پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وقت کا کیسا الٹ پھیر تھا۔

وہ خاموشی سے روتی رہی، جیسے کچھ نہ کہنا چاہتی ہو۔

ایک بار پھر ایک تاریک اور سیاہ رات ان کے درمیان آرہی تھی، گزری راتوں کی مانند اس میں سختی نہیں تھی، جبر نہیں تھا، اذیت نہیں تھی۔

وہ بیڈ پر ندی کے دو کناروں کی مانند دراز تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب ملنے والے تھے؟ ملنے والے تھے بھی یا نہیں؟

* * *

غموں کی جو فصیل ہے

وہ اس قدر طویل ہے
غضب تو ہے کہ اک نہیں
فصیل در فصیل ہے
تم اس کی ہر منڈیر پر
آرزوؤں کے تیل سے
چراغ دل جلاؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں!

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی تھی، وہی پرانی ڈگر! وہ اسی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتی۔ اس کے کام کرتی، اس کے پیر دباتی مگر رات ہوتے ہی وہ کسی سنڈریلا کی مانند بدل جاتی۔ خاموشی سے تکیہ اٹھاتی اور بیڈ کے دوسرے کنارے پر دراز ہو جاتی اور وہ صرف لب چبا کر رہ جاتا، وہ اس فاصلے کو پاٹنا چاہتا تھا مگر ایک چیز مانع تھی اور وہ تھا اربیجہ کا گریز۔

وہ جانتا تھا وہ اس سے بچ رہی تھی، وہ اب تک بڑے ضبط اور حوصلے سے خود پہ قابو پا رہا تھا، مگر کب یہ پیمانہ لبریز ہو جائے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

ان بیزار کن اور سرد مزاج دنوں میں ایک حیرت انگیز بات ندرت کے لیے نثار کا پرپوزل تھا۔ بی بی جان نے ندرت کے سرپرست کی حیثیت سے ہاں کر دی تھی۔ دونوں ہی شاہ فضل کے ملازم خاص کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔

وہ پندرہ جنوری کا دن تھا۔ صبح سے ہی فضا دھند آلود تھی۔ سرد ہوا گویا ہڈیوں میں گھس رہی تھی؟ شاہ فضل معمول کے کام نمٹا کے لوٹا تو اربیجہ اس کے لیے چائے لے آئی۔ اس نے تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا، اسے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔

رات جب وہ اپنے ارد گرد ڈھیروں کاغذات پھیلائے بے حد مصروف تھا اور اربیجہ نائٹ سوٹ بدلنے کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی تھی۔ دروازہ بجا کر ندرت اندر آئی، وہ دونوں کے لیے گرم دودھ لائی تھی۔

"سلام شاہ سائیں!" اس نے دودھ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

جواباً" اس نے صرف سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ شاہ فضل نے آواز دی۔

"جی سائیں!" وہ بولی۔

"مجھے تم سے نثار کے بارے میں بات کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

ندرت کا رنگ فق ہو گیا۔

"کک۔ کیا بات ہے سائیں!" وہ ہکلا گئی۔

ایک جھماکے سے اس کے دماغ میں اربیجہ کی شبیہہ لہرا گئی، وہ بھی تو ایسے ہی ڈرتی تھی، لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی آخر ندرت کیوں ڈر رہی تھی؟

"تم خوش ہو اس شادی سے؟" سنجیدگی سے پوچھا۔

"بیگم سائیں خوش ہیں، آپ خوش ہیں، میرے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو گی؟" وہ آنسو چھپانے کے لیے تیز تیز پلکیں جھپکانے لگی۔

"بات ہماری خوشی کی نہیں۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

اربیجہ نے برش کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں اس "براڈ مائنڈڈ" انسان کو دیکھا۔

ندرت خاموشی سے کھڑی رہی۔ شاہ فضل کھوجنے والے انداز میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔" اس نے جانے کی اجازت دی۔

وہ پلٹی اور سر جھکا کر باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ اٹھا، دروازہ لاک کیا اور آتش دان کے پاس دھری ایزی چیئر پہ آ کر براجمان ہو گیا۔ جلتی لکڑیوں اور بھڑکتے شعلوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا دل بھی تو ایسے ہی جل رہا تھا۔

اربیجہ اٹھی اور دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کے پاس چلی آئی۔

"دودھ لے لیں۔" اس نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"اربیجہ!" اس نے بے تابی سے اس کو دیکھا۔

"جی۔" اس نے نظر جھکا لی۔

شاہ فضل نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں پایا۔

"رکھ دو۔ لے لوں گا۔" اس نے نظریں پھر سے آتش دان پہ جما دیں۔

اربیجہ نے بنا کچھ کہے گلاس رکھا اور بڑی سی سلائیڈنگ ونڈو کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

لان تاریک اور دھندلا تھا، بالکل اس کی قسمت کی طرح وہ خاموش اندھیرے میں کچھ کھوجتی رہی۔

"مطلع صاف نہیں ہے، لگتا ہے بارش ہو گی۔" شاہ فضل کی آواز پر وہ چونکی، پتا نہیں وہ کب اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"پتا نہیں۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ کل "ملک ہاؤس" چلیں۔"

اربیجہ نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے اربیجہ کو بولنے پہ اکسایا، وہ اتنا خاموش رہتی تھی کہ اسے بات کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہ کتنی ہی دیر لایعنی باتیں کرتا رہتا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

شاہ فضل کو اس کی فرماں برداری سے عجیب سی وحشت ہوئی۔

"آؤ! سو جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔" وہ بیڈ کی سمت بڑھ گیا۔

وہ اس کی تقلید کرتی ہوئی بیڈ کے نزدیک آ گئی۔ وہ نیم دراز ہوا تو اس کے پیر دبانے کے لیے اس کے پائنتی بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں نے نرمی سے شاہ فضل کے پیروں کو چھوا تو ایک سکون اس کے اندر تک اترتا چلا گیا۔

اس نے بغور اربیجہ کو دیکھا۔ وہ گلابی نائٹ سوٹ میں تھی۔ بالوں کو چھوٹے سے ہیئر بینڈ میں سمیٹے، رنگت میں زردیاں لیے ہوئے، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور پپڑی زدہ ہونٹ، درد کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی اور سارے وجود میں پھیل گئی۔ اس نے اپنے پیر کھینچ لیے۔

اس نے دایاں بازو موڑ کر آنکھوں پہ رکھ لیا، جیسے اپنے تاثرات چھپانا چاہتا ہو۔

وہ اٹھی اور اپنی مخصوص جگہ پہ جا کے دراز ہو گئی۔ کمرے میں زہرناک خاموشی تھی۔ صرف دو نفوس کے تنفس کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ کچھ دیر بعد شاہ فضل نے بازو ہٹا کے اسے دیکھا، وہ اس کی طرف رخ کیے سو رہی تھی۔ ایک بازو سینے کے ساتھ لگائے اور دوسرا ہاتھ گال کے نیچے دھرے، بنا لحاف اوڑھے وہ بے خبر سو رہی تھی، اس نے لحاف اس پہ ڈالا اور روشنیاں بجھا دیں۔

"شاید جن کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا وہ اسی طرح سو جاتے ہیں، بے خبر اور مطمئن نیند اور میں؟ مجھے نیند ہی نہیں آتی، یوں لگتا ہے اب قسمت میں جاگنا ہی رہ گیا ہے۔"

وہ دل پہ ڈھیروں بوجھ سنبھالے اٹھا اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ٹیرس تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، سرد ہوا جسم کے آرپار ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ٹیرس پر رہا، رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی، وہ ہر احساس سے بے نیاز دور تاریکی میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔

جانے کتنا وقت بیتا، وہ تھک کر اٹھا اور اندر واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ لحہ بھر ٹھٹھک سا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی سرونٹ کوارٹر سے نکل کر لان کے خارجی حصے کی طرف جا رہا ہو، اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بہت دور سے خشک پتوں پہ چلنے کی مدھم سی آواز آ رہی تھی۔ اسے ایس پی عباس کی بات یاد آئی۔

"پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے اپنے ہی ہوتے ہیں، اپنے ارد گرد خصوصی نظر رکھیے۔"

وہ تیزی سے واپس پلٹا اور کمرے سے اپنا ریوالور نکال لایا۔ سیاہ چادر مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے سلیپر وہیں اتار دیے اور تیزی سے اس سمت بڑھنے لگا۔ اچانک بادل گرج اٹھے۔ بجلی کڑکی اور

تاریکی میں ایک پل کو روشنی سی پھیل گئی اور اس روشنی میں ایک درخت کے نیچے کھڑے دو سائے فوراً" اس کی نگاہ میں آگئے۔

وہ احتیاط سے ان کی سمت بڑھنے لگا۔ کچھ نزدیک پہنچ کر اس نے خود کو ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپایا اور سر نکال کر ماحول کا جائزہ لینا چاہا' اسی وقت ایک گھٹی گھٹی نسوانی چیخ نے اسے منجمد سا کر دیا۔ یہ آواز اس کے لیے بڑی جانی پہچانی تھی' دھوکہ کھانے کا سوال ہی نہ تھا۔

وہ ندرت کی آواز تھی۔

پھر یک لخت اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ الفاظ صاف نہیں تھے۔ اسے سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ کچھ مزید آگے سرکا۔

"اگر تو نے منہ کھولنے کی کوشش کی تو تیرا انجام بھی اس شاہ فیصل کی طرح ہوگا۔ سمجھی تو؟" کوئی غرایا تھا۔

بجلی کڑکی اور جیسے شاہ فضل پہ ہی آگری۔

یہ نثار کی آواز تھی' وہ حیرت کی زیادتی سے ساکت سا کھڑا تھا۔

"تو چھپا نہیں سکے گا۔ یاد رکھنا۔ شاہ سائیں پولیس سے تحقیقات کرا رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن وہ جان لیں گے کہ قاتل تو ہے۔ تو نے مارا ہے شاہ فیصل کو۔ یہ سچ سامنے آ کے رہے گا اور پھر تو دیکھنا نثار! تیرا کیا حشر ہوگا؟ شاہ سائیں تجھے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔"

غصہ میں اس کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

"کیسے پتا چلے گا؟ کون بتائے گا انہیں؟ تو۔۔۔ تو بتائے گی؟ بول؟" اس نے شاید ندرت کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔

وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخنے لگی۔

"میرے بال چھوڑ ذلیل آدمی! اس بات کا بدلہ لیا تو نے چھوٹے سائیں سے؟ کیا بگاڑا تھا انہوں نے تیرا؟" تکلیف اور غصہ میں اس کی آواز تیز ہو گئی۔

"جاننا چاہتی ہے نا! تو سن! شاہ فضل نے گلزار کو راکھے (کھیتوں کی رکھوالی کرنے والے) کے ساتھ رات کو پانی لگانے بھیج دیا تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ گئی، نمونیہ ہو گیا تھا اسے۔ اور تین دن۔۔۔ صرف تین دن بعد وہ مر گیا' اس شاہ فضل کی وجہ سے میرا بھائی مر گیا۔ یہ وڈیرے۔۔۔ یہ شاہ زادے خود کو فرعون سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو یوں سزائیں سناتے ہیں جیسے وہ ان کے زرخرید ہوں۔ یہ۔۔۔ یہ ہی ذمہ دار ہیں میرے بھائی کے مرنے کے۔ تب میں نے عہد کیا تھا کہ میں ان سے بدلہ لوں گا۔ اس شاہ فیصل کو مار ڈالوں گا تاکہ شاہ فضل کو پتا چلے کہ جب۔۔۔ جب خود پہ پڑتی ہے تو کیا گزرتی ہے۔۔۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔۔۔ کوئی نہیں جانتا کہ گولی میں نے چلائی تھی اور کوئی جان بھی نہیں سکے گا' مگر تو۔۔۔ غلطی ہوئی مجھ سے کہ تجھ کو بتا دیا۔ یہ بھول گیا کہ عورت ایسی چیز ہے جو کبھی راز نہیں رکھ سکتی مگر اب نہیں۔۔۔ اس سے پہلے کہ تو انہیں بتائے؟ میں تیرا قصہ ہی پاک کر دوں گا۔" وہ سفاکی سے بولا اور ریوالور نکال لیا۔

ندرت پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور شاہ فضل ساکت کھڑا سب سن رہا تھا۔ اس وقت وہ خون جما دینے والی سردی سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا۔

"تو مجھے مار ڈالے گا؟" وہ دہشت زدہ تھی۔

"ہاں" تیری صورت میں ایک مستقل خطرہ میرے ساتھ رہے گا' تو مجھے پیاری ضرور ہے مگر اپنی زندگی سے زیادہ نہیں۔" اس کا لہجہ کمینگی سے بھرا ہوا تھا۔

بادل زور سے گرجے اور بارش شروع ہو گئی۔ فضا میں فائر کی آواز گونج اٹھی۔ ندرت کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔

* * *

کمرے کی فضا میں تین نفوس کی موجودگی کے باوجود پر اسرار خاموشی تھی۔ وہ زمین پہ گری ہوئی تھی' اس کے کپڑوں پہ مٹی کے داغ تھے۔ دونوں ہاتھ سر پہ رکھے وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"یہ رونا دھونا بند کر لڑکی! اور مجھے سچ بتا یہ کھیل کب سے کھیل رہی تھی اس کے ساتھ مل کر؟" شاہ محمود کی آواز میں گرج اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

لڑکی کا رونا مزید تیز ہو گیا۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں تجھ سے؟" وہ دھاڑے۔ وہ ہنوز روئے جا رہی تھی۔

"فضل! اس کو یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں۔۔۔؟ میں اس کو کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔" ان کے منہ سے تیزاب کی مانند ابلتے ہوئے لفظ نکلے تھے۔ لڑکی کا رنگ فق ہو گیا۔

شاہ فضل نے لب بھینچتے ہوئے آگے بڑھ کر لڑکی کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"شاہ محمود فون لے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ انہیں چند ضروری فون کرنے تھے' چند ضروری فیصلے کرنے تھے۔

"شاہ فضل کے سر پہ "کار مختار" کی پگ رکھنا تھی۔"

اور۔

"نثار کی لاش کو ٹھکانے لگوانا تھا۔"

* * *

وہ ہی لوگ میرے قدموں سے زمین کھینچ رہے ہیں
جو لوگ میرے قد کے برابر نہیں آتے

وہ کسی بپھرے ہوئے شیر کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا' آنکھوں کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ چند لمحے دہکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا' پھر ایک دم اس پہ جھپٹ پڑا۔

تھپڑ اس کے چہرے پر مارتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔

"اگر میں فائر نہ کرتا تو وہ تمہیں ختم کر دیتا' جانتی ہو؟ بتاؤ مجھے۔ بولو کب سے جانتی تھیں تم؟" وہ غرایا تھا۔

"جب آپ لاہور گئے تھے اریحہ بی بی کو لے کر" وہ

سوہنی ہیئر آئل

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت =/100 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/100 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوا لیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے .... =/250 روپے
3 بوتلوں کے لئے .... =/350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"تب کیوں نہیں بتایا؟"

"بب۔۔۔ بتانا چاہتی تھی سائیں! پر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے دھمکاتا تھا کہ اگر کسی کو بتایا تو بدنام کردوں گا۔ سائیں۔۔۔ سائیں! میں ڈر جاتی تھی۔"

"تو۔۔۔ تو اس سے شادی کرنے چلی تھی۔" فضل نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔

"سائیں! میں۔۔۔ میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو بیگم صاحبہ نے سائیں کے حکم پہ۔۔۔ نثار نے بیگم سائیں سے بات کی تھی شادی کے لیے۔ مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں تھا، حکم دیا گیا تھا مجھے۔" فضل نے اس کا بازو جھٹکے سے چھوڑا۔

"شاہ سائیں! اگر آپ وہاں نہ آتے تو میں مرچکی ہوتی۔ اس وقت میں نے بڑی شدت سے اپنے رب سے دعا مانگی تھی کہ کاش! آپ کہیں سے آجائیں یا مجھے چند پل مل جائیں تاکہ میں آپ کو سب بتاسکوں۔ اور دیکھیں سائیں! اللہ تعالیٰ! کتنا مہربان ہے، آپ خود بخود وہاں آگئے۔" وہ تشکر سے [illegible] رہی تھی۔

کتنے بہت سے پردے ہٹ گئے آنکھوں سے۔

کتنے بہت سے راز فاش ہوگئے تھے۔

کتنی تلخ حقیقتیں سامنے آگئی تھیں۔

اگر وہ فائر نہ کرتا تو نثار، ندرت کو بھی موت کے منہ میں بھیج چکا ہوتا۔

اور شاہ فیصل کے اصل قاتل کا معما کبھی حل نہ ہوتا۔ منصور ہنوز مجرم رہتا اور اریبہ۔۔۔

"کل پنچائیت بیٹھ رہی ہے۔ کیا بیان دوگی؟" شاہ فضل نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ندرت نے سر جھکا لیا۔ تب ہی اریبہ وہاں آگئی۔

"نثار کی موت کے بارے میں؟" اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ندرت خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، کمرے میں موجود خاموشی مزید پراسرار لگنے لگی۔

"اس نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اگر آپ وہاں نہ آتے تو وہ اپنے گندے ارادوں میں کامیاب ہوجاتا۔ آپ کو دیکھ کر اس نے پستول نکال لیا۔ وہ پاگل ہورہا تھا اگر آپ اسے نہ مارتے تو وہ سب ختم کردیتا۔" ندرت کا لہجہ بڑا مستحکم تھا۔

شاہ فضل حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اتنی کمینگی کہاں سے لے لی تو نے؟" اس کے لبوں پہ مخلوظ مسکراہٹ آگئی تھی۔

"تجھ آپ سے" یہ آواز ندرت کی نہیں تھی۔ وہ بے ساختہ پیچھے مڑا۔

اسے کرنٹ سا لگا۔ اسٹڈی کے درمیانی دروازے پر اریبہ بڑی دیر سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اس کی پوری طرح روشن آنکھیں ثبوت تھیں۔ کہ وہ بڑی دیر سے جاگ رہی تھی اور کھڑی تھی۔

وہ آہستگی سے آگے بڑھ آئی۔

"تم جاؤ یہاں سے۔" اس نے تحکمانہ انداز میں ندرت سے کہا۔

ندرت نے شاہ فضل کی طرف دیکھا جس نے اسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا، وہ باہر نکل گئی۔

"واہ شاہ سائیں واہ۔" اس نے تالی بجائی۔

"سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہاں بند کمرے میں یہ منصوبہ بندی ہورہی ہے کہ نثار کی موت کو فطری رنگ کیسے دیا جائے اور میرے سامنے مظلوم بننے کا ناٹک کرتے ہیں آپ؟" وہ چبا چبا کر بولی تھی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ چاہتے ہیں نا! کہ میں آپ کو معاف کردوں؟ آپ کی طرف پلٹ آؤں تو پھر آپ کل یہ اعلان کردیں کہ میرا بھائی بے گناہ ہے۔ میرے بابا سے معافی مانگیں، آپ چاہتے تھے نا! کہ آپ کے پاس کوئی ایسا عمل ہو جو آپ مجھے دے کر مجھ سے معافی مانگ سکیں۔ چاہتے تھے نا؟ تو جان لیجیے! آپ کا یہ عمل مجھے ہمیشہ کے لیے آپ کا کردے گا۔" اریبہ نے پرسکون لہجے میں کہتے ہوئے داؤ کھیلا تھا۔

شاہ فضل جیسے زلزلے کی زد میں تھا۔ توڑ پھوڑ کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

"اور یاد رکھیے گا شاہ سائیں، جو شخص غلطی تسلیم نہیں کرتا، وہ اصلاح نہیں چاہتا۔ جب میں بے قصور ہوتے ہوئے سزا سہہ سکتی ہوں تو آپ غلط ہوتے ہوئے غلطی تسلیم کیوں نہیں کرسکتے؟"

وہ اپنی بات مکمل کرکے کسی جھونکے کی مانند باہر نکل گئی۔

* * *

اگلے دن پنچائیت کے تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ فیروز ملک کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ ایس پی عباس بھی موجود تھا۔

کاروائی شروع ہوئی۔ شاہ محمود کے مصاحب خاص نے تفصیل سے ساری حقیقت حاضرین کے گوش گزار کی۔ گلزار کی موت سراسر طبعی تھی، اس میں کسی قسم کا تشدد یا بدلہ کی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی، اس لیے نثار کے ہاتھوں شاہ فیصل کا قتل سراسر زیادتی اور ظلم قرار دیا گیا۔

ایس پی عباس نے حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نثار نے کس طرح موقع کا فائدہ اٹھایا اور سارا الزام منصور ملک کے سر دھر دیا گیا مگر سچ ہے کہ مجرم بے پناہ ہوشیاری کے باوجود اپنا کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے، اسی طرح اس سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ منصور ملک کے اور اپنے ریوالور میں فرق کو نظر انداز کرگیا۔

پھر ندرت کا بیان لیا گیا جو کہ حقیقت پر مبنی تھا اور اس نے بتایا کہ نثار نے اسے خود بتایا تھا کہ شاہ فیصل کو اس نے قتل کیا تھا جب اس نے نثار کو دھمکایا کہ وہ سب کچھ شاہ فضل کو بتادے گی تو وہ اسے بھی مارنے پہ تل گیا۔ حادثاتی طور پر وہاں شاہ فضل آگیا جس نے نثار کا اعتراف اپنے کانوں سے سن لیا۔ اور اگر اس وقت وہ نثار پر گولی نہ چلاتا تو اپنا جرم چھپانے کی خاطر نثار ندرت کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکا ہوتا۔

آخر میں منصور ملک کو بے گناہ قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی روپوش ہے، باعزت واپس آجائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

دوسرا اہم فیصلہ "کار مختار" کا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں شاہ فضل کے سر پر دستار رکھی گئی۔ خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا تھا جب فیروز ملک نم آنکھیں لیے اس کے قریب آئے۔ وہ بے ساختہ ان سے لپٹ گیا۔

"میں اور اریبہ شام کو آپ کے ہاں آئیں گے۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

اور ان کی آنکھوں کی حیرت اسے شرمندہ کرگئی تھی۔

* * *

ایک تھکا دینے والے بھرپور دن کے اختتام کے بعد وہ اس کے سامنے تھا۔

شاہ فضل نے آہستگی سے اسے قریب کرلیا۔

"اجازت ہے؟" اس کا مدھم لہجہ بے پناہ پیار لیے ہوئے تھا۔

اریبہ نے بے ساختگی سے مسکرا کر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تم بہت عظیم ہو اریبہ! تم نے ناحق اتنے مظالم سہے۔ میں۔۔۔ میں بہت شرمندہ ہوں مگر۔۔۔ مگر اب میرا وعدہ ہے کہ تمہیں بے پناہ پیار دوں گا، اپنی ساری زیادتیوں کا ازالہ کروں گا۔"

اریبہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں نے تمہیں رلایا ہے اریبہ! مگر اب نہیں۔ اب صرف محبتیں ہی محبتیں ہوں گی۔ خوشیاں، پیار اور مسکراہٹیں۔ بس!" وہ اس کی آنکھوں کو چومنے لگا۔

اریبہ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔